www.urduchannel.in

www.urduchannel.in

لہولہو منظر

(مختصر مختصر کہانیاں)

سلیم خان

(c) جملہ حقوق بحق ناشر محفوظ

یہ کتاب قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے مالی تعاون سے شائع کی گئی ہے نیز شائع شدہ مواد سے اردو کونسل کا متفق ہونا ضروری نہیں ہے۔

کتاب کا نام	:	لہولہو منظر
مصنف	:	سلیم خان
ناشر	:	تسلیم النساء خان
قیمت	:	68/روپئے
صفحات	:	88
سنِ اشاعت	:	First Edition.2017
تعدادِ اشاعت	:	500
کمپوزنگ	:	پاکیزہ گرافکس، بیاول
مطبع	:	الہدیٰ آفسیٹ پریس۔اسلام پورہ۔مالیگاؤں
اہتمام	:	رحیم رضا، رئیس فیض پوری
سرورق	:	ضیاء آرٹس، فیض پور
رابطہ	:	Mob;09730753897
مصنف کا پتا	:	مِلت نگر، فیض پور۔ضلع: جلگاؤں۔مہاراشٹر(425503)

☆ کتاب ملنے کا پتہ

نقیب بک ڈپو، سبھاش چوک فیض پور، ضلع۔جلگاؤں۔مہاراشٹر 425503

قاسمی بک ڈپو۔جام محلہ۔بھساول۔ضلع۔جلگاؤں 425201

الہدیٰ پبلیکیشنز ۷۔۸ نشاط روڈ۔اسلام پورہ مالیگاؤں۔ضلع: ناسک۔423203

www.urduchannel.in

”انتساب“

☆ شریکِ حیات تسلیم النساء

☆ بیٹی ثریّا پروین

☆ بیٹی (بہو) نشاط پروین

☆ فرزند وسیم خان اور مظہر خان کے نام

☆ جن کی چاہتیں اور محبتیں میرے دل میں جینے کی امنگیں پیدا کرتی ہیں ۔

کس نے پھیلی، یہ خون کی ہولی
ہر طرف ہے، لہو لہو منظر

شریف نواز

www.urduchannel.in

ادبی کوائف

اصل نام :۔ سلیم خان اسمٰعیل خان۔

قلمی:۔ سلیم خان۔

پیدائش:۔ 10/جولائی1956

تعلیم:۔ ایس۔ایس۔دی۔ایڈ۔

پیشہ:۔ وظیفہ یاب مدرس

پہلی تخلیق:۔ لاشوں کا سوداگر۔روزنامہ اردوٹائمز (مرتب:انجم رومانی)

سابقہ اشاعت:۔ سمجھوتا (بیسوی صدی) گونگی (ماہنامہ بانو) سوسال بعد (شاعر) آوارہ کتے (تریاق)
بھکاری (باجی) اندر کا موسم (پالیکا سماچار) مہکتے رشتے (عالمی سہارا)
فرق (فلمی ستارے) پانچ سال بعد (انقلاب) بدنام گلی۔سب ٹھیک ہے۔
(روزنامہ سہارا) لہولہو منظر، چاہت، خارزار کا مسافر (تعمیرِ ہریانہ)
سراب زدہ (اردوٹائمز ممبئی) فریب نظر (پیش رفت، دہلی)
دکھی آتما، مٹّی کا رشتہ، آخری قبر (غیر مطبوعہ)

تصانیف:۔ نیم چندن اور کویل۔(بچوں کے لیے کہانیوں کا مجموعہ)

مشاغل:۔ افسانہ نگاری، زبان وادب کا مطالعہ۔ادبی معمے حل کرنا۔
ادبی ثقافتی پروگراموں میں حصہ لینا، شرکت کرنا۔

رہائش:۔ مِلّت نگر، فیض پور۔ضلع۔جلگاؤں۔425503(مہاراشٹر)

موبائل نمبر:۔ 09730573897

ای میل:۔ khansaleem0313@gmail.com

فہرست

نمبر	عنوانات	صفحہ نمبر
۱	عرضِ مصنف:۔سلیم خان	۸
۲	تاثرات: احمد کلیم فیض پوری	۱۳
۳	تاثرات:۔ڈاکٹر عظیم راہی	۲۰
۴	پانچ سال بعد	۲۳
۵	اندر کا موسم	۲۶
۶	سوسال بعد	۲۹
۷	سب ٹھیک ہے	۳۱
۸	لہولہو منظر	۳۴
۹	مٹّی کا رشتہ	۳۷
۱۰	لاشوں کا سوداگر	۴۰
۱۱	فرق	۴۳
۱۲	چاہت	۴۵
۱۳	بھکاری	۴۸
۱۴	آخری قبر	۵۰
۱۵	مہکتے رشتے	۵۳
۱۶	فریبِ نظر	۵۷

www.urduchannel.in

۱۷	سراب زدہ	۶۱
۱۸	خارزار کا مسافر	۶۴
۱۹	آوارہ گتے	۶۷
۲۰	دُکھی آتما	۷۱
۲۱	بدنام گلی	۷۶
۲۲	گونگی	۷۹
۲۳	سمجھوتا	۸۳

عرضِ مصنف

نثری ادب میں کہانی کو سب سے اعلیٰ مقام حاصل ہے۔اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ کہانی، کہانی کار کو اپنے جذبات، احساسات اور مطمحِ نظر آزادی سے بیان کرنے کا موقع فراہم کرتی ہے۔ وہ بدلتی قدروں کو اپنا کر زمانے کے ساتھ چلنے کا ہنر بھی جانتی ہے۔ یہی خوبی اسے دوسری نثری اصناف سے ممتاز و ممیّز کرتی ہے۔اس لیے ہر دور میں کہانی اظہار و بیان کا ذریعہ اور قارئین کی پسندیدہ صنف رہی ہے۔ کہانی اپنے عہد کی مترجم ہوتی ہے وہ انسانی تہذیب وتمدن کی داستان اور سیاسی، مذہبی، معاشرتی ارتقاع کی تاریخ مرتب کرتی ہے۔

پریم چند سے اردو کہانی کے ایک نئے دور کا آغاز ہوتا ہے۔ پریم چند، سعادت حسین منٹو ،راجندر سنگھ بیدی، کرشن چندر اور عصمت چغتائی افسانوی ادب کے ایسے پانچ رتن ہیں جو فنی صفات کی بنا پر ہر ایک اپنی الگ چمک رکھتا ہے۔ان قلم کاروں نے کہانی کو دلچسپ بیانیہ اسلوب اور تخلیقی عناصر سے سنوارا نکھارا۔ اسے زندگی کے حقائق اور عصری مسائل کا محور بنا کر کہانی سے قارئین کا جذباتی ربط قائم کیا۔

www.urduchannel.in

ان فن کاروں میں منٹو کا کام سب سے نمایاں نیز جداگانہ رہا۔ انھوں نے کہانی کو نیا فارم، نئی تکنیک عطا کی۔ [کسی زمانے میں افسانہ وقت بتانے کا آرٹ رہا ہوگا لیکن ہمارے عہد تک پہنچتے پہنچتے وقت بچانے کا آرٹ ہوگیا ہے۔ یہ کہنے سے زیادہ نہ کہنے کا آرٹ ہے۔ بہ الفاظ دیگر یہ اخراج و اختصار کا آرٹ ہے۔ لیکن منٹو نے اسے ایجاز سے ہم کنار کر دیا۔] (منٹو نمبر سہ ماہی نخلستان ۲۰۰۱ء شمارہ نمبر ۳۔ ۴ ص ۲۲ نگارش، شین۔ کاف۔ نظام) اختصارِ لفظی کا یہ فن جب کمال کو پہنچا تو افسانچہ وجود میں آیا۔ منٹو نے اپنے زمانے کے سلگتے موضوعات فسادات، جنسیات اور سماجی سیاہ کاری پر اپنے بے باک قلم سے جراحی کا کام کیا اور صنف افسانچہ ایجاد کی۔ افسانچوں کے ذریعے قاری کو گہری فکر و نظر عطا کی اور تیسری آنکھ سے دیکھنا سکھایا۔

جوگندر پال نے اپنے چست جامع بیانیہ میں مختصر افسانے اور افسانچے لکھ کر سعادت حسن منٹو کی روایت کو استحکام بخشا اور بحسن و خوبی آگے بڑھایا۔ آپ نے اس ضمن میں کیا خوب بات کہی ہے:

[''بات افسانے اور افسانچے کی نہیں ہے، اور افسانچہ صرف اختصار کا حامل نہیں ہوتا۔ دونوں کا اپنا وجود ہے۔ اپنے اپنے تقاضے ہیں۔ اصل بات تو فن کاری ہے کہ آپ نے کس طرح فن کو زندگی کے سانچے میں ڈھالا۔ پھر آپ کی بات آپ کے پڑھنے والوں تک پہنچی بھی یا نہیں''] (منقول۔ ماہنامہ آج کل، جون ۲۰۱۶ء نگارش، اسلم جمشید پوری)

دہلی سے شائع ہونے والا اپنے زمانے کا مقبول و معروف رسالہ ماہنامہ شمع نے (مختصر مختصر کہانی دو ہی صفحات پر مکمل) اس نوٹ سے مختصر کہانیاں شائع کر کے اس تحریک کو جلا بخشی۔ اس زمانے میں محمد بشیر مالیر کوٹلوی، سیف الرّحمان عباد۔۔۔ نے بڑی کامیاب مختصر کہانیاں لکھیں۔

فی زمانہ مختصر کہانی کے حوالے سے ممتاز کہانی کار رتن سنگھ کی ایک الگ پہچان ہے، موقر ادبی

جرائد ان کی کہانیاں بڑے اہتمام سے شائع کرتے ہیں۔ نیا ورق (شمارہ نمبر 43) نے گوشہ رتن سنگھ میں ۲۷ مختصر کہانیاں شائع فرما کر ان کی فنّی عظمت کا اعتراف کیا ہے۔ ان کے موثر، اچھوتے اسلوب نے کہانی اور قاری کا رشتہ مضبوط کیا ہے۔ جسے راوی فراموش نہیں کر سکے گا۔

الغرض، کہانی اپنے ارتقائی سفر پر رواں دواں ہے اور چھوٹے بڑے سبھی قلم کار اس کی قابلِ قدر خدمات انجام دے رہے ہیں۔ آج، مذہبی منافرت، سیاسی بازی گری، جنسی انحراف، دہشت گردی، فرقہ واریت اور عصمت دری جیسی بگڑتی اخلاقی قدروں کے سبب آئے دن رونما ہونے والے حادثے اور واقعات کہانی کار کو جھنجھوڑتے ہیں اور اس کا قلم تڑپ اٹھتا ہے۔ مصروف زندگی اور زمانے کی رفتار کے پیشِ نظر ان موضوعات پر طویل کہانیوں کے ساتھ مختصر کہانیاں اور افسانچے دھڑلّے سے لکھے جا رہے ہیں۔ جنھیں رسائل و اخبارات اہتمام سے شائع کر رہے ہیں اور قارئین بڑی دلچسپی اور شوق سے پڑھ رہے ہیں۔

قارئین کرام، مختصر کہانیوں کا یہ مجموعہ میری دوسری کاوش آپ کے پیشِ نظر ہے۔ پہلی تصنیف بچوں کے لیے بعنوان ''نیم، چندن اور کویل'' ۲۰۱۲ء میں منظرِ عام پر آ چکی ہے۔ طلبہ، اساتذہ اور احباب نے اس کتاب کی پذیرائی فرمائی۔ انھیں کی حوصلہ افزائی کے سبب یہ مختصر کہانیوں کا مجموعہ ''لہولہو منظر'' اشاعتی مراحل سے ہمکنار ہوا ہے۔ اس کامیابی پر میں سب سے پہلے اللہ تبارک تعالیٰ کا شکرانہ پیش کرتا ہوں کہ وہی قادرِ مطلق ہے۔ اسی نے انسان کو عقل و فہم اور علم کی دولت عطا کی ہے۔ ناچیز نے جو اپنے جذبات و احساسات قلم بند کیے ہیں، یہ سب اسی کی نوازش و عنایت ہے۔ ''رب العالمین میں تیرا شکر گزار ہوں۔''

احمد کلیم فیض پوری صاحب کو اپنے ادبی حلقے کی سرپرستی حاصل ہے۔ آپ سیمیناروں اور افسانوی محفلوں میں بصیرت افروز رہنمائی فرما کر اپنے تجربات کے موتی لٹا رہے ہیں۔ حسبِ دستور اس

www.urduchannel.in

پڑاؤ پر بھی انھوں نے بڑی فراخ دلی سے میرا حق ادا کیا۔ اس نوازش کے لیے میں ان کا مرہونِ منت ہوں۔ گرامئ حقانی القاسمی صاحب کی طرزِ نگارش مجھے بے حد متاثر کرتی ہے۔ لہٰذا میری دلی خواہش تھی کہ اس کتاب میں آپ کی تاثراتی تحریر شامل ہو۔ موصوف نے میری درخواست قبول فرما کر مجھے شاد کیا ہے۔ میں صمیمِ قلب سے ان کا شکر گزار ہوں۔ بابائے افسانچہ عظیم راہی صاحب ایک سچّے فنکار اور بڑے ملنسار آدمی ہیں۔ وہ صنفِ افسانچہ کی بے مثال خدمات انجام دے رہے ہیں۔ ''افسانچہ کی روایت'' اور ''افسانچہ کی روایت اور پیش رفت'' ان کی دونوں کتابیں داد و تحسین وصول کر چکی ہیں۔ انھوں نے اپنی بے پناہ مصروفیات کے باوجود میری ایک درخواست پر اس مجموعے کو اپنے زریں تاثرات سے نوازا۔ یہ بھی ان کے اعلیٰ معیار اور ادبی خدمات کی ایک مثال ہے۔ رحیم رضاء میرے بھائی نما دوست ہیں۔ کسی نے ٹھیک ہی کہا ہے کہ اردو زبان دلوں کو جوڑتی ہے۔ واقعی یہ دوستی اردو کی عنایت ہے۔ ہر موڑ پر میں ان کے اور وہ میرے ساتھ ہوتے ہیں۔ اور یہی جذباتی ہم آہنگی ہمیں آگے بڑھاتی ہے۔ اس کتاب کے اشاعتی مراحل میں بھی مجھے ان کا بہر طور تعاون حاصل رہا۔ حسابِ دوستاں در دِل۔ محترم فاروق سیّد صاحب ماہ نامہ گُل بوٹے کے ذریعے ادبِ اطفال کی بے مثال خدمات انجام دے رہے ہیں۔ بچوں کے لیے لکھی ہوئی میری تخلیقات وہ بڑے اہتمام سے شائع فرما کر میری قدر دانی کرتے ہیں۔ میں ان کے اخلاص کا مرہونِ منت ہوں۔ آگرہ، فیض پور سے کافی دور ہے، لیکن برادرم محمد قیوم میؤ دل کے قریب رہتے ہیں اور وقتِ ضرورت وہ میرا پر خلوص تعاون کیا کرتے ہیں۔ میں ان کا سپاس گزار ہوں۔

علاقہء خاندیش کے سماجی، تعلیمی رہنما اقراء ایجوکیشن سوسائٹی کے صدر الحاج عبدالکریم سالار صاحب کی ادب نوازی بھی قابلِ قدر ہے۔ وہ اپنی بے پناہ مصروفیات کے باوجود ادبی کی تقاریب میں شرکت فرماتے ہیں نیز اردو کی ترقی اور فروغ کے لیے ہمہ وقت دامے، درمے، سخنے تیار رہتے ہیں۔ فی

الحال آپ کا ادارہ بزم ادب الفیض فاؤنڈیشن، خاندیش کا ادبی سرمایہ (ماضی تا حال) مرتب کرنے کا فریضہ انجام دے رہا ہے۔ انشاءاللہ ان کا یہ کارِ نمایاں تاریخ ساز اہمیت کا حامل ثابت ہوگا۔ ناچیز کو بھی موصوف کی محبتوں کا شرف حاصل ہے۔ لہٰذا ایک قلم کار کی حیثیت سے میں انھیں صمیمِ قلب سے خراجِ تحسین پیش کرتا ہوں۔

ضلع جلگاؤں کے فن کار: رشید قاسمی، مشتاق کریمی، قیوم اثر،، جاوید انصاری، معین الدین عثمانی، انجم رضوی، صغیر احمد، ڈاکٹر شفیق ناظم، وسیم عقیل شاہ، عبدالرؤف شیخ صاحب (ریٹائرڈ پرنسپل، ڈاکٹر ذاکر حسین اردو ہائی اسکول اینڈ جونیئر کالج یاول)، قیوم راز، ایم رفیق، ایس ایم انور، شکیل احمد، جابر خان، رئیس فیض پوری،، صابر پرواز، ساحر نصرت، شریف نواز، ملک شریف سر، جاوید قاضی، ایوب سر (ساودا)، خلیل جناب (نصیر آباد) شیخ محمد حنیف (رکن مہاراشٹر ساہتیہ اردو اکادمی) ان حضرات کی نیک خواہشات اور پذیرائی نے مجھے آگے بڑھنے کی تحریک دی ہے۔ میں ان احباب کا صدقِ دل سے ممنون و شکر گزار ہوں۔

الغرض حالاتِ حاضرہ کے تناظر میں لکھی ہوئی یہ مختصر مختصر کہانیاں زندگی کے حقائق پر مبنی ہیں۔ مجھے یقین ہے ان کہانیوں میں آپ اپنے جذبات و حساسات کی ترجمانی پائیں گے۔ بہر حال میری خواہش ہے کہ کہانیاں پڑھ کر اپنے مفید مشوروں سے نوازیں کہ آپ کے مشورے میرے تخلیقی سفر میں مشعلِ راہ ثابت ہوں گے۔۔ شکریہ۔!

سلیم خان

www.urduchannel.in

''پیش لفظ''

ہم اپنے اظہارِ خیال کی تمہید خود اپنے لکھے ہوئے سے کرنے کی بجائے اردو کے ممتاز ناقد قاضی عبدالرحمٰن ہاشمی سے ایک حد تک استفادہ کرتے ہوئے آگے بڑھنا چاہتے ہیں۔ایک جگہ وہ لکھتے ہیں، ''اردو میں تقریباً ایک صدی پر مشتمل مختصر افسانے کی روایت اپنے آغاز میں راشد الخیری اور سجاد حیدر یلدرم کے توسط سے انشائیہ نما کہانیوں نیاز فتح پوری اور مجنوں گورکھپوری کے ہاتھوں رومانی وفور کی حامل تحریروں کی شکل میں پریم چند تک پہنچی جو صحیح معنوں میں اس کی صنفی ہیت ادبی قدر و قیمت اور ضرورت واضح طور پر سامنے آئی۔اس لحاظ سے پریم چند جدید افسانہ کے بنیاد گزار اور ایک اہم فن کار کی صورت میں سامنے آتے ہیں۔

یہ بات اپنی جگہ تسلیم شدہ ہے کہ اردو افسانے کی عمر سوسوا سو سال سے زیادہ نہیں ہے۔اس عرصے میں افسانہ جن ادوار سے گزرا ہے اس کے لکھنے والوں نے بھی اپنے اپنے دور کی قابلِ لحاظ ترجمانی کی ہے۔چنانچہ متذکرہ بالا افسانہ نگاروں کا دور دورِ اول قرار پاتا ہے۔دورِ ثانی ترقی پسند عہد کہلاتا

ہے۔جو اردو افسانے کو اصل صورت میں عالمی اعتبار بخشتا ہے۔چنانچہ کرشن چندر، عصمت چغتائی، راجندر سنگھ بیدی، سعادت حسن منٹو، رشید جہاں اور احمد ندیم قاسمی وغیرہ۔اس ترقی پسند دور کے سرخیل کہلاتے ہیں۔اس فہرست میں قرۃ العین حیدر، اور انتظار حسین شامل نہیں کہ ان عظیم فن کاروں نے کسی تحریک سے وابستگی کیے بغیر خود اپنی آزادانہ پہچان بنائی۔ترقی پسند تحریک بھی زمانے کی دست برد سے محفوظ نہیں رہ سکی۔اور کمسنی میں ہی ادب کے تخلیق کاروں اور پرستاروں نے اس کی قبر پر فاتحہ پڑھی۔لیکن اس بات سے انکار ممکن نہیں کہ اردو ادب کی تاریخ کا یہ سب سے سنہرا دور تھا۔جس سے ایک نسل نے بھرپور اثر قبول کیا۔بیدی جیسے افسانے پھر نہیں لکھے گئے، پھر کوئی کرشن چندر اور عصمت پیدا نہیں ہو سکے۔

ترقی پسند تحریک کے دورِ عروج میں ہی اس کے متوازی محمد حسن عسکری، ممتاز مفتی، ممتاز شریں اور عزیز احمد وغیرہ نظر آتے ہیں۔جنہوں نے راست اظہار کی بجائے بیانیہ کو قدرے مبہم استعاراتی پیرائے میں پیش کیا اور بعض بہت کامیاب کہانیاں لکھیں۔نظریے سے انحراف کی لہر سے بے پرواہ ترقی پسند افسانہ ارتقاء کی منزلیں طئے کرتا رہا۔اور سماجی مشن سے وابستہ سرگرم فن کار جوق در جوق شامل ہوتے رہے۔چند لوگ جنھیں بے حد شہرت اور مقبولیت حاصل ہوئی وہ ہیں، احمد علی، بلونت سنگھ، حیات اللہ انصاری، قاضی عبدالستار غیاث احمد گدی، سہیل عظیم آبادی، اقبال مجید، انور عظیم، جیلانی بانو، صدیقہ بیگم، عابد سہیل رام لعل رتن سنگھ، کلام حیدری، اقبال متین جوگندر پال، اور سرلا دیوی وغیرہ۔اس کے بعد دورِ جدید نے ۱۹۶۰ء کے آس پاس ترقی پسند تحریک کے شانہ بہ شانہ اپنی آنکھیں کھولیں۔جن کے فکر و فلسفے پر مبنی افسانے ترقی پسند افسانہ سے بالکل مختلف رہے۔اس دور کے لکھنے والوں میں سریندر پرکاش، انور سجاد، خالدہ حسین، بلراج مین را، منشا یاد، احمد ہمیش، زاہدہ حنا، قمر احسن، اور نیر مسعود وغیرہ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

www.urduchannel.in

لیکن جدیدیت کے بطن سے جو تجریدیت نکلی اس نے لایعنی اور بے تکے افسانوں کو جنم دیا۔لوگ افسانے میں کہانی ڈھونڈتے ڈھونڈتے بیزار آ گئے۔ یہ دور اس لحاظ سے بڑا منحوس کہا جا سکتا ہے کہ افسانے کا قاری افسانے سے بہت دور چلا گیا تھا۔آخر جلد ہی جدیدیت کا سورج بھی غروب ہو گیا۔دورِ حاضر کے افسانہ نگاروں کی خصوصیت یہ ہے کہ اس نسل نے خود اپنی مرضی سے اپنی منزل کا تعین کیا اور زندگی کی ہر آن منقلب ہوتی ہوئی خارجی اور داخلی جہت کو اپنے آئینہء ادراک کے روبرو رکھتے ہوئے بیان سے زیادہ اشارے کنائے اور رمزیاتی پیرائے میں انکشافِ حقیقت کا فریضہ انجام دیا۔اس نسل کے نمائندہ افسانہ نگار ہیں، سید محمد اشرف، خالد جاوید، ترنم ریاض، سلام بن رزاق، عبدالصمد، انور خان شموئل احمد، مرزا حامد بیگ، علی احمد نقوی، شفق، احمد داؤد شوکت حیات، مظہر الزماں خان، مشرف عالم ذوقی، طارق چھتاری، رشید امجد، بیگ احساس، حمید سہروردی، حسین الحق، انجم عثمانی، ذکیہ مشہدی، ساجد رشید، آصف فرخی، غضنفر علی، معین الدین جینا بڑے، ابنِ کنول، مقدر حمید، نورالحسنین، شفیع جاوید، صدیق عالم، مشتاق مومن، اکرام باگ، دیوندر اِسّر، اسرار گاندھی، نعیم کوثر، اقبال انصاری، صغریٰ مہندی، غزالہ ضیغم، ف۔س اعجاز، گلزار، آمنہ ابوالحسن، قمر جہاں، مشتاق احمد نوری، نگار عظیم وغیرہ۔ بظاہر یہ فہرست طویل ہے۔تاہم اس میں ان ہی افسانہ نگاروں کو شامل کیا گیا ہے، جن میں سے بعض اعلیٰ تخلیقی بصیرت کے مالک ہیں۔کچھ اوسط اور بیشتر وہ ہیں، جن کے مزاج کو یک رنگی اور یکسانیت ہی راس آئی ہے۔

دورِ حاضر کے ان افسانہ نگاروں کے بارے میں یہ نہیں کہا جا سکتا ہے کہ یہ ترقی پسند تحریک جدیدیت یا لایعنی مابعد جدیدیت سے ہم رشتہ ہے۔ بلکہ انھوں نے اپنی افتادِ طبع اور اعلیٰ فنی صلاحیتوں کی بنا پر اپنی الگ راہ نکالی۔اس تناظر میں ہمارے علاقہ کے جواں فکر افسانہ نگار سلیم خان کو دیکھیں تو وہ اپنی بے پناہ صلاحیتوں اور تخلیقی قوتوں کے سبب اس فہرست کا قابلِ قدر حصّہ بنے دکھائی دیتے ہیں۔خوشی اس

بات کی ہے۔وہ اپنے اگلوں کے نقشِ قدم پر احتیاط کے ساتھ قدم رکھتے چلے جا رہے ہیں۔ یہ احتیاط یقیناً انھیں اس منزل کی طرف لے جائیگی جو کسی ہونہار ادیب کو مطلوب ہوتی ہے۔

یہ بات دل کو خون کرتی ہے کہ سلیم خان کو کہانی کے لیے وہ میدان اور ماحول نہیں ملا ہے۔جوان کی فنی مہارتوں کو جلا بخشتا۔ایک دیہی علاقے سے سروکار رکھنے والے قلم کار کو کم ہی سامانِ قلم میسر آیا ہے۔پھر یہ کہ ما بھی انھوں نے اپنے گاؤں کا آسمان دیکھا ہے، جب کہ جگہ جگہ آسمان ہیں، افق ہیں۔ جہاں زندگی سانس لیتی دکھائی دیتی ہے۔ یہ سروکار ان کے افسانوں کو وسیع کینوس عطا کرتا جس میں قوسِ قزح کے رنگ بھرے ہوئے انھیں دیکھا جا سکتا تھا۔لیکن پھر بھی ان کے پاس سوچ ہیں، فنکارانہ بصیرت ہے۔تخلیقی توانائی کا خزینہ ہے۔جو فطرت کے عطیات ہیں۔ان کو لکھنے کے لیے مہمیز عطا کرتے ہیں۔اور آگے بڑھنے کے لیے انھیں شب و روز بے چین رکھتے ہیں۔ یہ اضطراب ان کے افسانوں میں پہلو بہ پہلو کروٹیں لیتا دکھائی دیتا ہے۔

کوئی کہانی دل کے درد کے بغیر کہانی نہیں بنتی۔کہانی سوچ و فکر کا لہو مانگتی ہے۔ بلاشبہ سلیم خان کی کہانیوں میں ان کے دل کا درد شامل دکھائی دیتا ہے۔ان کے افسانوں مین خون کے جو دھبے دکھائی دیتے ہیں، وہ انھیں کی سوچ و فکر سے لہو بن کر صفحہء قرطاس پر ٹپک پڑے ہیں۔اس لحاظ سے ان کی کہانیاں ایک ایسے قلم کار کی زائیدہ ہیں جو اپنے خونِ دل میں انگلیاں ڈبو کر لکھنے کو اپنا ادبی فریضہ تصور کرتا ہے۔غرض ہمارے نزدیک سلیم خان ایسے افسانہ نگار قرار پائے ہیں، جو کہانی کہنے کا ہنر تو جانتے ہیں۔ایک حساس سنجیدہ اور ذمہ دار افسانہ نگار کی پہچان بھی رکھتے ہیں۔اسی لیے کہا جا سکتا ہے کہ ان کا مستقبل روشن ہے۔

افسانہ نگاری ایک طرح کی شیشہ گری ہے۔ یا اس سے بھی نازک تر کوئی چیز۔سلیم خان اس سے

www.urduchannel.in

باخبر ہے۔لہٰذا ہلکے ہاتھوں سے افسانہ گوندھتے ہیں کہ کہیں آبگینے کو ٹھیس نہ پہنچ جائے۔یہی وجہ ہے کہ ان کے افسانوں کی تشکیل ایسی خوبصورتی سے ہوئی ہے کہ قاری ان کے حسن میں کھوسا جاتا ہے۔

کسی بھی کتاب کا پیش لفظ عام طور پر اس بات کا متقاضی نہیں ہوتا کہ اس شامل تمام افسانوں پر گفتگو کی جائے لہذا ہم اپنے پیش لفظ میں سلیم خان کے دو ہی تین افسانوں پر سرسری بات کریں گے، جس سے اندازہ ہوسکتا ہے کہ وہ ادب کے تشنہ کاموں کو اپنی تحریر سے کیا امرت رس دینا چاہتے ہیں۔''سو سال بعد'' سلیم خان کی ایسی کہانی ہے، جو آج کے بے ایمان معاشرے کا پول کھولتی ہے۔آج، فساد ، دہشت، عصمت دری، مکروفریب، اخلاقی پستی، کیا نہیں ہے۔جوانسانی تہذیب کو داغدار نہیں بنائے۔چنانچہ کہانی کا وہ اکثر دکھی رہتا ہے۔اس لیے آج سماج اور معاشرے میں ایسے لوگ بھی ہیں جو انسانی قدروں کی پامالی پر رنجیدہ دکھائی دیتے ہیں۔ہر دور اس بات کا شاہد ہیکہ وہ کسی دردمند دل سے خالی نہیں رہا ہے۔چاہے وہ کسی ذی فہم کا دل ہو یا کسی بے زبان کا۔یہ مثال زندہ ثبوت ہے اس بات کا کہ انسانوں کی دہکاتی آگ کو ایک چڑیا اپنے بوند بوند پانی سے بجھانے کی ناکام کوشش کررہی تھی۔آخر اللہ نے اسی آگ کو گلزار بنا کر بندے کو صحیح سلامت نکالا۔

کہانی کا جیویشی کہانی کے وہ کے ہاتھ کی لکیریں ڈھونڈتا رہ جاتا ہے، جن میں کہیں بھی درد و الم، حزن وملال، دہشت وعصمت دری کا شائبہ تک دکھائی نہیں دیتا۔کہانی کار جو خود جیوتشی بھی ہے۔بجا طور پر کہتا ہے کہ ایسے ہاتھ سو سال پہلے ہوا کرتے تھے۔بلکہ اس سے بھی پہلے، جب رانی کرناوتی کی آبرو بچانے کے لیے بادشاہ ہمایو پہنچ جایا کرتے تھے۔سلیم خان آپ کے ہاتھوں میں ایسی کہانیاں تڑپتی ہوں تو بے شک آپ انھیں صفحۂ قرطاس پر لاتے رہیں۔یہ انسانی خدمت کہلائے گی۔''لہولہو منظر'' فساد کے موضوع پر لکھی ہوئی ایک جاں سوز کہانی ہے۔اردو کا افسانوی ادب فسادات کی کہانیوں سے بھرا پڑا

ہے۔یہ موضوع ہی ایسا ہے جو ہر وقت ہر زمانے میں قلم کار کو اپیل کرتا رہا ہے۔خصوصاً اردو افسانے پر بجلی بن کر گرتا ہے۔اس لیے کہ فساد کی آگ سے کسی راشد، حامد شاہد اور ساجد ہی کو وابستگی رہی ہے۔یہ کیسی ستم ظریفی ہے کہ ہم آہ بھی کرتے ہیں تو ہو جاتے ہیں بدنام۔علامہ اقبال، اللہ، انھیں جنت نصیب کرے ۔اگر آج زندہ ہوتے تو آہ کرنے پر محض بدنامی کا ذکر نہیں کرتے بلکہ آہ کرنے پر قتل کردیے جانے کا ان کے ذہن میں ضرور آتا۔لیلیٰ نے کہا تھا پتھر نہیں مارو میرے دیوانے کو، آج کہا جاتا ہے۔پتھر مار مار کر ہلاک کردو، اس کو جو فرزانہ بنا پھرتا ہے۔

بہرحال لفظوں کے دروبست میں جا کر سلیم خان نے اس کہانی کو پرتاثیر بنادیا ہے۔ایک کہانی اور جس کا عنوان ہے''دُکھی آتما''اس کہانی کے ڈانڈے اس لوک سے پرلوک تک جا کر ملتے ہیں۔اس لحاظ سے یہ ایک اسطوری کہانی ہوگئی ہے۔اسے لوک، پرلوک، آتما، مہاماتما، پرماتما وغیرہ جیسے ہندی کے خوبصورت لفظوں سے سجایا سنوارا گیا ہے۔یہ کہانی ہمیں اس ماحول میں لے جاتی ہے۔جہاں سچ مچ آتماؤں کا ڈیرہ ہوا کرتا ہے۔

کہانی کی بنت ایسی ہے جہاں ایک بھی روزن ایسا نہیں ملتا جس سے تنقید نگار کو آسانی سے گھسنے کا موقع فراہم ہوتا ہو۔کہانی میں تین آتماؤں کا ذکر ہے۔جن میں دو خوش وخرم ہیں، جبکہ تیسری دکھی آتما ہے۔کیوں نہ ہوگی کہ دھرتی پر کانٹوں کی باڑھ لگانے سے پرلوک میں پھولوں کے باغ کیونکر مل سکتے ہیں۔احساسِ گناہ اگر دھرتی پر ہی ہوجائے تو یہاں معافی تلافی کے دروازے کھلے ہوتے ہیں۔جب کہ وہاں کوئی دروازہ ایسا ہے ہی نہیں۔آیئے، اب یہ دیکھیں کہ افسانے تو مختصر ہی ہوا کرتے ہیں۔کسی بھی کتاب کے افسانوں کو Short Stories سے ہی موسوم کیا جاتا ہے۔جو کتاب کے پانچ چھ صفحات سے لے کر اٹھارہ انیس صفحات تک پھیلے ہوتے ہیں۔لیکن سلیم خان کے یہ افسانے اس قدر مختصر ہیں کہ

www.urduchannel.in

انھیں مختصر افسانے کہنے کی بجائے منی کہانی یا افسانچہ ہی کا نام دیا جا سکتا ہے۔سلیم خان کا قلم اتنا کم قوت بھی نہیں ہے کہ افسانے میں پلاٹ، واقعات اور کردار نگاری وغیرہ کا احاطہ نہ کر سکے۔ پھر وہ کیوں مختصر ترین افسانے لکھتے رہے ہیں۔اگر وہ چاہیں تو ہم انھیں ریم کے ریم کاغذ فراہم کر دیں۔

اگر ہم ان کے کان میں کچھ کہنا چاہیں تو یہ ضرور کہیں گے کہ آپ کی کہانی جو دکھی آتما کا ٹائٹل رکھتی ہے، اس میں تین چہرے پیش کیے گئے ہیں۔ نیتا کا چہرہ،، فوجی جوان

اور زانی مرد کا چہرہ۔ہم کہتے ہیں سماج میں کتنے ہی سیاہ وسفید چہرے بھرے پڑے ہیں۔ان میں سے دو تین چہرے اور اٹھا لیے جاتے تو کیا دکھی آتما کا کینوس بڑا نہیں ہو جاتا۔یہی بات اور کہانیوں پر صادق آسکتی ہے۔

سلیم خان نے بچوں کے لیے بھی لکھا ہے۔اور بہت خوب لکھا ہے۔انھوں نے انتظار حسین ،کرشن چندر، سلام بن رزاق اور بانو سرتاج جیسے سرکردہ قلم کاروں کی روایت کو اپنایا ہے۔اور یہ جو بڑوں کے لیے لکھا ہے، یہ بھی بڑوں سے فیض کا نتیجہ ہے۔اگر وہ نہ ہوتے ہم بھی نہ ہوتے۔لکھنا لکھانا بڑا تھکا دینے والا کام ہے۔لیکن اپنی شناخت بنانے کے لیے تھکن کی پرواہ کیے بغیر لکھنا ہے۔آگے بڑھنا ہے۔ پیچھے مڑ کر نہیں دیکھنا ہے۔منزل پانے کی جستجو ہو تو منزل کبھی ہاتھ سے نہیں جاتی۔ ملتی ہی ہے۔

آخر میں یہ کہ سلیم خان نے اپنے افسانوں کے ذریعے قاری کو نہ صرف چونکانے کا کام کیا ہے، بلکہ اس کے دل میں اتر جانے کا سامان بھی مہیا کیا ہے۔یقین ہے ادب دوست اس کتاب کو اپنی محراب میں رکھ کر بھول نہ جائیں گے۔سلیم خان کے لیے ہماری نیک خواہشات۔

گرین پارک، بھساول۔ احمد کلیم فیض پوری ۱۵ ستمبر ۲۰۱۶ء

سلیم خان کے ''لہولہو منظر'' پر ایک نظر

علاقۂ خاندیش کی اپنی ایک مرباط ومبسوط ادبی روایت ہے۔ جو عہد بہ عہد بتدریج ترقیوں کی راہ پر رگامزن، اپنی اہمیت کو منوانے میں کامیابیوں سے ہمکنار رہی ہے۔آج کے گلوبل دور میں یہ علاقہ شاعری کے ساتھ بطورِ خاص نثر کے میدان میں بھی اپنی سرگرمیوں کے سبب مجھے زیادہ فعال اور بحال نظر آتا ہے۔ایک زمانے میں اگرچہ بھساول کے آل انڈیا مشاعرے بہت مقبول تھے۔جن کے تذکرے آئے دن سننے کو ملتے رہتے ہیں لیکن اب تو اس علاقے میں مشاعروں کے ساتھ ادبی سیمناروں کی ریل پیل اور محافلِ افسانہ کی دھوم دکھائی دیتی ہے۔اس ادبی چہل پہل نے ضلع جلگاؤں کے تخلیقی ماحول کو مزید سرگرم عمل بنا دیا ہے۔ان پروگراموں میں شرکت سے، میرا بھی اس علاقے سے گہرا تعلق ہو گیا ہے۔جس کا ذکر میں اکثر یہاں کے احباب سے کرتا رہتا ہوں۔اس خصوص میں فیض پور کی ادبی فیض یابیوں کا ذکر بھی سلیم خان کے حوالے سے بے محل نہ ہوگا کہ احمد کلیم فیض پوری جیسے علاقے کے اہم سینئر کہنہ مشق افسانہ نگار کا تعلق بھی اسی سرزمین سے ہے۔اور رفیق عادل مرحوم کے بعد ایم۔رفیق اور ان کے ساتھ سلیم خان

www.urduchannel.in

کی علمی ادبی اور تخلیقی سرگرمیاں ان دنوں عروج پر دکھائی دیتی ہیں۔اس علاقے کی ایک خاص بات جو مجھے ہمیشہ متاثر کرتی رہتی ہے وہ درس وتدریس سے جڑے احباب کی اپنی تعلیمی مصروفیت کے باوجود فنونِ لطیفہ سے گہری دلچسپی رہی ہے۔ اور تخلیقی اعتبار سے یہ لوگ زیادہ فعال نظر آتے ہیں۔ادبی شعبہء میں اساتذہ کی یہ سرگرمی واقعی قابلِ ستائش ہونے کے ساتھ قابلِ تقلید بھی ہے۔

سلیم خان بھی درس وتدریس کے مقدس پیشے سے وابستہ رہے ہیں،اپنی ملازمت کی ابتداء سے ہی ان کی علمی ادبی تخلیقی سرگرمیوں میں دلچسپی رہی ہے۔ان کی تخلیقات ملک کے موٴقر ادبی رسائل وجرائد کی زینت بنتی رہتی ہیں۔انھوں نے بچوں کے لیے بھی خوب لکھا ہے۔اور ایک مجموعہ نیم چندن اور کوئل کے نام سے شائع ہوکر مقبول ہوا ہے۔اب انھوں نے اپنی مختصر کہانیوں کا مجموعہ لہولہو منظر کے نام سے ترتیب دیا ہے۔سلیم کان کی یہ کہانیاں ان کے بیدار ذہن اور حساس طبیعت کا پتہ دیتی ہیں۔ان کہانیوں میں انھوں نے اپنے اطراف کے ماحول میں پھیلے مسائل کو اپنی تخلیقی صلاحیتوں سے مختصر مگر موٴثر انداز میں پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔زیرِنظر مجموعے میں جملہ بیس کہانیاں شامل ہیں۔ ہر ایک کہانی پر بات کرنا تو ممکن نہیں۔میں چاہوں گا کہ دیگر کہانیوں کا تجسس برقرار رہے اور پڑھنے والا خود اپنا فیصلہ کرکے اپنی رائے قائم کریں۔البتہ چند کہانیوں پر اپنے تاثرات پیشِ خدمت ہیں۔

''پانچ سال بعد'' میں ان لیڈروں پر زبردست طنز ہے جو اگلے الیکشن میں ہی صورت دکھاتے ہیں۔''لاشوں کا سوداگر'' میں فساد کی ہولناکی ایک نئے انداز میں نظر آتی ہے۔جو بڑھتی ہوئی فرقہ پرستی کے زخم کے درد وکرب کا احساس دلاتی ہے۔تو وہی ٹائٹل کہانی ''لہولہو منظر'' گجرات سانحہ کے پس منظر میں فرقہ وارانہ فساد کی منہ بولتی تصویر ہے۔''اندر کا موسم'' میں میاں بیوی کی محبتیں جب جسم بوڑھے ہونے لگتے ہیں تو ان کی محبتیں روح کی گہرائی میں اتر کر اپنی انتہا کو پہنچ جاتی ہیں۔جو انھیں اپنے جوان

ہونے کا احساس دلاتی ہے۔فطری محبت کی اس خوب صورت احساس کی یہ ایک اچھوتی کہانی ہے۔''مہکتے رشتے'' میں بیوی کے مرجانے کے بعد اس سے وابستہ یادوں اور اس سے جڑے رشتوں کے آباد ہونے کی کہانی ہے۔آج کی لالچ بھری خودغرض اور بے مروّت دنیا میں ''سو سال بعد'' کے نام سے لکھی کہانی کا تیر راست قاری کے دل میں پیوست ہوجاتا ہے۔ جو آج کے ترقی یافتہ معاشرے پر ایک زبردست چوٹ ہے۔''سب ٹھیک ہے'' گلوبل دور میں والدین کے ساتھ اولاد کے ناروا سلوک کا حقیقی منظرنامہ ہے۔تو وہیں بدنام گلی میں ایک آدمی کی ظاہری پارسائی کے بھرم کو بے نقاب کرتے ہوئے ایک طوائف کی زندگی کے عروج وزوال کی کہانی بیان کردی ہے۔''سمجھوتا'' زندگی کے سرد گرم حالات سے نبرد آزما کرشنا کو زندگی کے ساتھ آخر مجبوراً سمجھوتا کرنا پڑتا ہے۔''آخری قبر'' میں ایک گورکن کی زندگی کا المیہ ہے اور سراب زدہ میں انہوں نے ملازمت پیشہ افراد کے تبادلوں میں سیاست سے پیدا شدہ حالات کے کرب کو یوں موثر ڈھنگ سے قلمبند کیا ہے کہ اس درد میں ان کا اپنا دکھ بھی شامل ہوگیا ہے۔غرض ہر کہانی راست زندگی سے جڑ کر اپنے عصر کے مختلف مسائل کو پراثر انداز میں بیان کرتی ہے۔ان کہانیوں کی زبان صاف ستھری سلیس اور رواں دواں ہے۔جو اپنے پڑھنے والوں کو یقیناً متوجہ کرنے میں کامیاب رہے گی۔

آخر میں یہی کہونگا کہ وہ اپنی مختصر کہانیوں کے کینوس کو افسانہ کی ڈیلنگ اور ٹریٹمنٹ کے ساتھ اپنے گہرے مشاہدے اور زندگی کے کڑے تجربوں سے اور آگے بڑھائیں اور ان میں مزید وسعت پیدا کریں تو مستقبل قریب میں ان کے پاس مزید بہتر امکانات کی قوی امید کی جاسکتی ہے۔

بقول علامہ اقبال۔''ذرا نم ہو تو یہ مٹی بہت زرخیز ہے ساقی''

اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ۔

ڈاکٹر عظیم راہی (اورنگ آباد)

www.urduchannel.in

پانچ سال بعد۔۔۔۔۔۔۔!!

غربت تمام رشتے توڑ دیتی ہے۔اپنے بھی قریب سے کترا کے نظریں چُرا کر نِکل جاتے ہیں۔ غموں کی ان تاریک راہوں میں کوئی ہمدم کوئی غم گُسار دِکھائی نہیں دیتا جو محبّت کے دیپ جلائے جسے اپنا کہا جائے۔مگر دلِ نامراد پھر بھی محبت اور چاہت کا متلاشی ہوتا ہے۔ایسے ہی قسمت کے ماروں میں بیوہ تُلسی کا ایک چھوٹا سا پریوار تھا۔

الیکشن کا زمانہ تھا۔ ہر امیدوار اپنے اپنے طریقے سے الیکشن جیتنے کی جدوجہد میں لگا ہوا تھا۔ سیاستداں اپنی سحر بیانی سے عوام کو خوش حال زندگی اور روشن مستقبل کے سُنہرے خواب دِکھا رہے تھے۔ سماجی اہل کاروں سے سیاسی سوداگروں کی خُفیہ ملاقاتیں ہو رہی تھیں۔ بدنام زمانہ امیدوار مولویوں اور پنڈتوں کے ہاتھوں عقیدت کی مالائیں پہن کر پارسائی دِکھا رہے تھے۔

سابق صوبائی وزیر شری گردھاری لال بھی اپنے پارٹی ورکرس اور کرائے کے کنویسرس کی پُشت پناہی میں ہمدردی اور خلوص کا مظاہرہ کر کے جنتا کا اعتماد حاصل کرنے نِکلے ہوئے تھے۔ان کی پرچار

پھیری شہر کی کُشادہ سڑک سے ہوتی ہوئی ایک پتلی گلی سے جھونپڑ پٹی میں داخل ہوئی۔ جہاں حسرت و یاس میں ڈوبا ہُوا دُھواں دُھواں منظر، جھکے ہوئے در و دیوار، کٹے پھٹے سائبان اور گلیوں میں نالیوں سے اُبلتی ہوئی غلاظت بہہ رہی تھی۔ اونچی اونچی عالیشان عمارتوں کے درمیان ان جھگیوں کا وجود بِلا شبہ ایک کوڑا دان سا تھا، مگر گردھاری لال کے لئے یہ بھگوان کا وردان تھا۔

گردھاری لال کی پرچار پھیری جب بیوہ تُلسی کی جھونپڑی کے سامنے پہنچی تو انہوں نے دیکھا کہ آنگن میں پانچ چھ برس کا ایک نیم برہنہ بچّہ روٹی کی رٹ لگائے رو رہا ہے۔اس کا دھنسا ہوا پیٹ اور پچکے ہوئے جبڑے فاقہ کشی کے مظہر تھے۔ سامنے جھلنگا کھاٹ پر بیٹھا ہوا نحیف بوڑھا اسے بے چارگی سے دیکھ رہا تھا۔ گردھاری لال نے آگے بڑھ کر بوڑھے کو دست بستہ نمسکار کیا اور پھر اس بچے کے (جو، اب سہم کر چپ ہو گیا تھا) سر پر شفقت سے ہاتھ پھیرا۔ جیب سے سو/۱۰۰ کا نوٹ نکالا، اور بچے کی مُٹھّی میں تھما کر دروازے میں اداس کھڑی ہوئی عورت (تلسی) کی جانب بھیج دیا۔ اُسی وقت ہجوم سے کسی وفا دار کاریہ کرتا نے نعرہ بلند کیا: ''غریبوں کے ہمدرد، گردھاری لال!'' ''زندہ باد۔!'' ''زندہ باد۔!'' ''زندہ باد۔!'' ''گردھاری لال، زندہ باد۔!'' گردھاری لال کا سینہ خوشی سے پھول گیا، اور وہ اردگرد کھڑے ہوئے لوگوں کی طرف ہاتھ جوڑ کر ممنون تاثرات کا اظہار کرتے ہوئے آگے بڑھ گئے۔

تلسی نے بازار سے دال آٹا لا کر فوراً کھانا بنایا اور اپنے بھوکے پریوار کو بھر پیٹ کھِلایا۔ کھانا کھا چکنے کے بعد جب بچے نے گردھاری لال کے متعلق استفسار کیا تو تلسی لمحہ بھر اپنے نادان بچے کو حیرت سے دیکھتی رہی پھر کہا: ''بیٹے، وہ منتری جی ہیں۔ دکھیوں کے ہمدرد، غریبوں کے پالن ہار'' تھوڑی دیر کے لئے گردھاری لال کا پُرخلوص پیکر بچے کے ذہن میں اُبھر آیا۔ اس کے ننھے سے وجود میں خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ اور وہ اچھل کر زندہ باد، زندہ باد کہتے ہوئے باہر نکل گیا۔

www.urduchannel.in

چندروز بعد مہنگائی اور بے روزگاری کے باعث پھر تلسی کے یہاں فاقہ ہوا، اور بچہ بھوک سے بے تاب ہوکر رونے لگا۔ روتے روتے اچانک اسے گردھاری لال یاد آگئے اور ان کی مہر ومحبت کا دل فریب منظر اس کی آنکھوں کے آگے پھر گیا۔ اس نے آہستہ آہستہ خود پر قابو پایا۔ اپنی بوسیدہ قمیض کی پھٹی آستین سے آنسو پونچھے اور اپنے دادا جی کے قریب جا کر بڑی معصومیت سے پوچھا: ''دادوٗ، منتری جی کب آئیں گے؟'' بچے کے سوال پر جہاں دیدہ بوڑھے کی آنکھیں بھر آئیں۔ اس نے اپنے کم سن پوتے کو لرزتے ہاتھوں سے بانہوں میں بھر لیا۔

بچہ اب بھی بوڑھے کو سوالیہ نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ ''بولئے نا دادوٗ، منتری جی ادھر کب آئیں گے۔!؟'' تب بوڑھے نے آہ سرد بھر کر کہا: ''بیٹے، وہ تو پانچ سال بعد آتے ہیں۔!!'' اور پھر بچہ کچھ سوچتے ہوئے مایوسی اور ناامیدی کی اتھاہ گہرائی میں ڈوبتا چلا گیا۔!!!

''اندر کا موسم''

دسمبر کا مہینہ تھا۔ بے موسم بارش کی وجہ سے سردی اچانک بڑھ گئی تھی۔ سورج گھنے بادلوں کے کمبل میں دبکا ہوا تھا اور فضا میں گہری دھند چھائی ہوئی تھی۔ بس میانہ روی سے اپنی منزل کی طرف رواں تھی۔ کھڑکی کے ٹوٹے ہوئے شیشوں سے داخل ہونے والے یخ بستہ ہوا کے جھونکے مسافروں پر قہر ڈھا رہے تھے۔ ہر مسافر سردی سے بچنے کا جتن کیے ہوئے، اپنے آپ میں سمٹا ہوا تھا۔ بس میں سکوت طاری تھا۔ صرف انجن کی گڑگڑاہٹ اور ہوا کی سنسناہٹ سنائی دے رہی تھی۔

راہل اپنی نو بیاہتا بیوی منورما کے ساتھ گرم کپڑوں میں ملبوس ولایتی شال اوڑھے سردی کا مزہ لے رہا تھا۔ اسکی اگلی سیٹ پر بیٹھے ہوئے بوڑھا بوڑھی اپنے بوسیدہ کپڑوں میں سردی سے بچنے کی ناکام کوشش کر رہے تھے۔ بڑھیا اپنی ساری کا پلّو سر اور گلے کے گرد لپیٹ چکی تھی۔ بوڑھا اپنے گنجے سر اور کانوں کو گمچھے (رومال) سے باندھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ لیکن اسکے لرزتے ہاتھوں سے رومال بندھ نہیں پا رہا تھا۔ بڑھیا برابر اس کی مدد کر رہی تھی، مگر رومال بار بار کھل جاتا اور بوڑھا سراپا کانپ کر رہ

www.urduchannel.in

جاتا۔ بڑھیا بوڑھے کی حالت دیکھ کر بے چین ہوجاتی اور کبھی خود بھی کانپ کر رہ جاتی۔

راہل بڑے انہماک سے بوڑھے جوڑے کی محبّت دیکھ کر محظوظ ہو رہا تھا اور منورما آنکھیں موندے اپنی نئی زندگی کے سنہرے خواب دیکھ رہی تھی۔ راہل نے اسے ہلکا سا دھکّا دے کر بوڑھا بوڑھی کی جانب متوجہ کیا۔ منورما انھیں دیکھ کر شرما سی گئی۔ راہل نے پیار سے اس کا چہرہ اپنے ہاتھوں میں لیکر کہا، ''منور، ڈارلنگ! یہی محبّت تو ہماری تہذیب کا خاصہ ہے۔ ہمارے یہاں میاں بیوی تا دمِ حیات ایک دوسرے کا ساتھ اسی طرح نبھاتے ہیں۔ رشتوں کی پاسداری جو ہمارے ملک میں ہے کسی اور ملک میں نہیں اور یہی ہماری خوشحال ازدواجی زندگی کا راز ہے۔''

اسی وقت راہل کی نظر بازو کی سیٹ پر بیٹھے ہوئے ایک جوڑے پر پڑی اور اس کے وجود میں ایک پر کیف لہر دوڑ گئی۔ نوجوان نے گرم کوٹ میں اپنے بچّے کو ایسے لپیٹ رکھا تھا کہ صرف اس کی ناک اور آنکھیں ہی دکھائی دے رہی تھیں۔ وہ دونوں (میاں بیوی) بچّے کو اپنے آغوش میں اسطرح لیے ہوئے تھے کہ سرد ہوا کی لہر اسے چھو نہیں پا رہی تھی۔ انھیں اپنا خیال تھا نہ سردی کا احساس بلکہ وہ بے حد مسرور دکھائی دے رہے تھے۔ یہ منظر دیکھ کر راہل کے ذہن میں اپنے بچپن کی ایک دھندلی سی تصویر ابھر آئی۔ ماں باپ اپنے بچوں کا کتنا خیال رکھتے ہیں اور اس کا دل لطف انبساط سے معمور ہوگیا۔ اسے آگے کی سیٹ پر بیٹھے ہوئے بوڑھا بوڑھی کا خیال آیا۔ اس نے فوراً اٹھ کر انھیں دیکھا۔ سردی سے اکڑے ہوئے بوڑھا بوڑھی سنگی بت کی طرح دکھائی رہے تھے۔ فرط جذبات سے اس کا دل تڑپ اٹھا۔ اس نے فوراً اپنی اونی شال بدن سے اتاری اور انھیں اڑھادی۔ اپنی شال میں سکڑی سمٹی منورما یہ دیکھ کر چونک پڑی۔ راہل کی جانب حیرت سے دیکھتے ہوئے اس نے کہا، ''یہ کیا راہل بڑی جان لیوا سردی ہے، تم ٹھٹھر کر رہ جاؤ گے۔!'' بیوی کی بات کا اس پر کوئی اثر نہ ہوا۔ کیونکہ وہ چاہت و محبت کے جذبے سے سرشار

اپنے آپ میں گم تھا۔

منورما نے جھانک کر بوڑھے جوڑے کو دیکھا۔ وہ دونوں شال میں سمٹے ہوئے ایک جسم و جاں لگ رہے تھے۔ اس نے دوسرے مسافروں پر بھی نظر دوڑائی۔ اسے لگا مانو سبھی دو سے ایک ہوگئے ہوں۔ راہل کے نیک جذبے پر اس کی طبیعت جھوم اٹھی، اس نے انگڑائی لینے کے انداز میں اپنی شال پھیلائی اور بے ساختہ راہل کو لپیٹ کر اپنی بانہوں میں لے لیا۔

بس بدستور منزل کی جانب رواں تھی۔ موسم شدید سرد ہوگیا تھا، مگر بس کے اندر کا موسم گرم تھا، مکمل گرم۔!!

www.urduchannel.in

''سوسال بعد۔۔۔۔۔!''

وہ اکثر دکھی اور اداس رہتا۔اس کی اداسی کا سبب اس کا اپنا غم نہیں، تڑپتی سسکتی انسانیت کا درد تھا۔کم سن لڑکیوں کی عصمت دری، دنگے فساد، دہشت گردی اور بم بلاسٹ جیسے واقعات سے اس کی روح کانپ اٹھتی اور رونگٹے کھڑے ہوجاتے۔آپسی اختلافات، حق تلفی، مکروفریب اور خدمتِ خلق کے پس پردہ بے ایمانی جیسی سماجی برائیاں دیکھ کر اسے بڑی کوفت ہوتی۔''اشرف المخلوقات اور یہ اخلاقی پستی''اس کے وجود میں کڑواہٹ سی پھیل جاتی۔اور وہ اداسی کی اتھاہ گہرائی میں ڈوب جاتا۔

اپنے خیالوں میں گم وہ دفتر سے گھر لوٹ رہا تھا کہ یکا یک ایک طرف سے آواز آئی،''بابو جی، ادھر آجایئے آپ کی پریشانی دور ہوجائے گی۔!''

اس نے آواز کی طرف مڑکر دیکھا۔'' آجایئے بابو جی!'' فٹ پاتھ پر بیٹھے ہوئے جیوتشی نے اصرار کیا۔جیوتشی کی آواز میں وہ اخلاص تھا کہ غیر ارادی طور پر اس کے قدم جیوتشی کی جانب بڑھ گئے۔جیوتشی کے سامنے بیٹھتے ہوئے اس نے کہا،''پنڈت جی آپ نے اس معصوم (طوطے) کو کیوں اسیر کر رکھا ہے، یہ

تو آپ ہی کی زبان بولتا ہے اور آپ ہی کے اشارے پر۔۔۔۔۔!'' آپ نے ٹھیک کہا لیکن کیا کریں بابو جی، چاند ستاروں کو چھونے والے اس انسان کی فطرت کا یہ المیہ ہے کہ وہ سیدھی بات کبھی نہیں سمجھتا۔'' واہ پنڈت جی واہ، بہت خوب۔ہاں تو لیجیے اور بتایئے میری پریشانی کا حل مگر میں سیدھی بات سمجھنا چاہتا ہوں۔''اس نے جیوتشی کے سامنے اپنا ہاتھ پھیلاتے ہوئے یوں کہا گویا کہ یہ ایک چیلنج ہو۔

اس کا ہاتھ دیکھ کر جیوتشی حیرت سے دیکھتا ہی رہ گیا۔اس کے ہاتھ کی لکیریں عام لوگوں کے ہاتھوں کی لکیروں سے بالکل مختلف تھیں۔اس نے ہاتھ کا بغور معائنہ کیا اور بہت کوشش کی مگر وہ ہر بار کچھ سمجھنے کے بعد لکیروں میں الجھ کر رہ جاتا۔''بابو جی ایک منٹ!'' جیوتشی نے عاجزی سے کہا اور اپنے جھولے سے ایک پرانی کتاب نکالی۔اس کے بوسیدہ اوراق کو بڑی احتیاط سے الٹ پلٹ کر ہاتھ کا ایک نقش ڈھونڈ نکالا۔اس کے نیچے لکھی تحریر کو بغور پڑھا اور پھر اس نقش سے بابو جی کے ہاتھ کی لکیروں کو ملا کر دیکھا۔یک لخت جیوتشی کی ذہنی کشمکش معدوم ہوگئی مگر ساتھ ہی چہرے پر مایوسی ابھر آئی۔

جیوتشی کی کیفیت دیکھ کر اس نے دریافت کیا،'' کیوں کیا ہوا پنڈت جی، کیا میرے ہاتھ کی لکیریں بہت پیچیدہ ہیں؟''

''نہیں بابو جی۔''

''تو پھر یہ الجھن کیسی، بتایئے میری پریشانی کا حل!''

''جیوتشی نے شکستہ لہجے میں جواب دیا،''بابو جی آپ تو ہمیشہ پریشان ہی رہیں گے۔''

''لیکن کیوں؟''اس نے حیرانی سے پوچھا۔

جیوتشی نے قدرے توقف کے بعد نظریں جھکا کر جواب دیا،''اس لیے کہ آپ سوسال بعد پیدا ہوئے ہیں۔!!''

www.urduchannel.in

''سب ٹھیک ہے۔''

''بیگم، تم کچھ اداس لگ رہی ہو، کیا بات ہے۔!؟''

''نہیں نہیں، سب ٹھیک ہے۔'' بیوی نے چہرے پر نقلی مسکراہٹ بکھیر کر جواب دیا۔ دراصل وہ اپنے شوہر کو پریشان دیکھ کر فکرمند تھی۔ اسے تو ہر حال میں جینا گوارا تھا، مگر وہ اپنے شوہر کو رنجیدہ اور مایوس نہیں دیکھ سکتی تھی۔ دو ماہ سے بیٹے نے گھر خرچ کے لیے پیسے نہیں بھجوائے تھے۔ تنگ دستی اور لاچاری بڑھتی جا رہی تھی اور آس کے بجھتے چراغ بے کسی کا احساس جگا رہے تھے۔ وہ جانتی تھی کہ اس کا شوہر بوڑھا ضرور ہو چکا ہے لیکن خودداری جو اس کی ذات کا خاصہ ہے، آج بھی قائم ہے اور شاید تا دمِ آخر رہے گا۔ وہ فاقہ کرے گا، مگر کبھی کسی کے آگے ہاتھ نہ پھیلائے گا۔ مانگے گا تو صرف اپنے مالکِ حقیقی سے۔ ''کیا کیا جائے۔'' اس نے سوچا، اور سوچتی رہی۔۔۔۔ اسکے ذہن میں یہ بات آئی کہ کسی بہانے بیٹے سے رابطہ کیا جائے تا کہ اسے اپنے بوڑھے ماں باپ کی ذمہ داری کا خیال آ جائے۔

صبح چائے کے دوران اس نے شوہر سے کہا، ''اپنے اکلوتے بیٹے کی کچھ خبر تو لیجیے، وہ کسی پریشانی

یا مصیبت میں تو مبتلا نہیں۔ میں نے کئی بار رابطہ کیا، بیل بجتی رہی مگر بات نہ ہو سکی۔ اسکے بال بچّے کیسے ہیں خدا جانے۔!'' ''بیگم، تم ٹھیک کہہ رہی ہو، میں بچّوں سے ملنے ضرور چلا جاتا مگر تمہارا صاحب زادہ دوسری منزل پر رہتا ہے، اور تم تو جانتی ہو، سیڑھیاں چڑھنا اترنا میرے لیے کتنا محال ہے۔'' تو مکان کے بجائے اسکے دفتر ہی چلے جایئے۔ خیریت معلوم ہو جائے گی۔ میں نے آج رات بہت بُرا خواب دیکھا ہے۔'' بیوی کی رندھی آواز اور بھیگی آنکھیں دیکھ کر شوہر کا دل پگھل گیا۔

اور پھر وہ اسّی سالہ بوڑھا کسی طرح بیٹے کے دفتر پہنچ گیا۔ چپراسی نے جب بیٹے کو باپ کے آنے کی خبر دی تو اس نے سپاٹ لہجہ میں کہا، انھیں برآمدے میں بٹھاؤ، آتا ہوں۔

بیٹے نے چند روز قبل اپنی شادی کی سالگرہ کے موقع پر بیوی کو تحفے میں سونے کا ہار پیش تھا اور آرام و آسائش کی کئی چیزیں خریدی تھیں لیکن اسے نہ اپنے بوڑھے ماں باپ کی ضرورتوں کا خیال آیا نہ ہی اپنی کوتاہی کا احساس ہوا۔ اپنا کام ختم کرنے کے بعد وہ دفتر سے باہر آیا اور بڑی ناگواری سے بولا: ''ابّو آپ کو یہاں نہیں آنا چاہیئے تھا، میں فی الحال بہت تنگ دست اور پریشان ہوں۔''

''نہیں بیٹے میں تو۔۔۔۔!''

''اب آپ بات مت بنایئے،'' اس نے باپ کا جواب کاٹتے ہوئے کہا۔ باپ کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا سا چھا گیا اور سماعت ماؤف ہو گئی۔ بوڑھا کب اور کیسے دفتر سے سڑک پر پہنچا، اسے خیال نہیں۔ بیٹے کی زبان سے نکلے ہوئے لفظوں کی برچھیاں اسکا دل لہولہان کرتی رہیں ''آخر بیٹے بڑے ہو کے اپنے ماں کی چاہت، محبّت، ان کا ایثار ان کی قربانیاں کیوں بھول جاتے ہیں، انھیں اپنے ماں باپ کی محتاجی اور معذوری کا احساس کیوں نہیں ہوتا، اپنی اولاد میں انھیں اپنا بچپن کیوں نہیں دکھائی دیتا، یہ مہکتے پھول دہکتے انگارے کیوں بن جاتے ہیں۔!؟'' اسکا دکھی من چاہ رہا تھا کہ وہ بستی سے دور جنگل بیاں بان

www.urduchannel.in

چلا جائے یا کسی تیز رفتار گاڑی سے ٹکرا کے خودکُشی کر لے۔ مگر اسی وقت اسے اپنی وفا شعار بیوی کا خیال آیا ،جس نے زندگی کے ہر موڑ پر اس کا ساتھ دیا تھا، وہ گھر پر بڑی بے تابی سے اس کا انتظار کر رہی ہوگی۔ اس کے بغیر ایک لقمہ نہیں کھائے گی۔ اسی احساس نے اسے سیدھا اپنے گھر پہنچا دیا۔

بیوی نے اسے ٹھنڈا پانی پلایا اور پھر اسکی بوڑھی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے پوچھا: ''ملاقات ہوئی اپنے بیٹے سے؟'' بوڑھے نے اپنے چہرے پر گہری مسکراہٹ بکھیر کر

جواب دیا، ''بیگم تم خواہ مخواہ پریشان ہو رہی تھی، وہ کمپنی کے کسی کام سے ودیش گیا ہوا تھا۔ مجھے اچانک دیکھ کر خوشی سے لپٹ گیا، خیریت پوچھی۔ پھر آفس کے لان میں بیٹھ کر خوب ساری باتیں کیں۔ اپنا ٹفن بھی جبراً مجھے کھلا دیا۔ کہہ رہا تھا فرصت ملتے ہی ماں سے ملنے آؤنگا اور ہاں، گھر خرچ کے لیے پیسے بھی دیے ہیں۔

''اور اسکے بال بچّے۔۔۔۔!؟'' بیوی نے فرطِ مسرت سے پوچھا۔

''ہاں، ہاں، سب ٹھیک ہے۔!!''

لہولہو منظر

بلڈ پریشر دیکھنے کے بعد ڈاکٹر نے انجکشن لگایا اور پھر دوائیاں لکھتے ہوئے کہا، انھیں آرام کی سخت ضرورت ہے۔ ویسے گھبرانے کی کوئی بات نہیں، سفر کی تکان اور بے خوابی کے سبب ایسا ہوتا ہے۔

ممبئی، ناگپور ہو یا احمد آباد سورت، وہ اپنے تجارتی دورے سے ایک ہفتہ کے اندر ہی لوٹ آیا کرتا تھا۔ مگر اس مرتبہ وہ دس بارہ روز بعد گھر لوٹا تھا۔ اس کی حالت دیکھ کر اہلِ خانہ بے حد فکر مند اور پریشان تھے۔

وہ پھر سوتے میں اچانک جاگ گیا اور دیوانوں کی طرح اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ ماں لپک کر اس کے قریب پہنچی

''کیا ہوا بیٹے!؟ کیا بات ہے!!؟

''کون رو رہا تھا ماں؟''

''نہیں بیٹے کوئی بھی نہیں!''

www.urduchannel.in

''ہاں ماں میں نے ابھی ابھی کسی کے رونے کی آواز سنی ہے۔''

''نہیں بیٹے، شاید وہ سامنے پان کی دکان پر کوئی گا رہا تھا۔''

وہ اپنے اطراف کا جائزہ لے کر پھر سو گیا۔لیکن وہ سوتے میں جاگ رہا تھا، نہ جانے کتنے دنوں سے۔

بادلوں کی گرج اور بجلی کی کڑک سے وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا اور پھٹی پھٹی آنکھوں سے باہر دیکھنے لگا۔ماں اس کے قریب ہی بیٹھی ہوئی تھی۔

''بیٹے تم تو کمسن بچے کی طرح گھبرا رہے ہو، بارش ہو رہی ہے باہر۔ایسے موسم میں تم تو بچپن میں خوب نہایا کرتے تھے۔اور آج تمہیں ڈر لگ رہا ہے۔تم بتاتے کیوں نہیں کیا ہو گیا ہے تمہیں!؟''

''آں، ہاں۔۔۔!!'' وہ قدرے چونک کر ماں کی جانب متوجہ ہوا۔

''میں نے کہا، تم ٹھیک تو ہو نہ۔!''

''ہاں ماں میں بالکل ٹھیک ہوں۔اس نے اپنے وجود پر ایک نظر ڈالتے ہوئے کہا۔جیسے واقعی وہ کسی خطرناک حادثے سے بال بال بچ گیا ہو۔

ہوا کے زور سے دروازوں اور کھڑکیوں کے پردے اڑنے لگے۔بوچھار سے پانی کا ایک ریلا فرش پر سانپ کی طرح لہرا کر بہنے لگا۔وہ بے ساختہ چیخ پڑا۔اس مرتبہ بیوی کانپ کر رہ گئی۔اور بچے ڈر کر جاگ گئے۔

''راشد میرے بیٹے،'' ماں تڑپ اٹھی اور اسے بانہوں کے حصار میں لے لیا، ''میرے لعل، یہ اچانک تمہیں کیا ہو گیا ہے۔کیا کسی آسیب کی گرفت میں آ گئے ہو تم''

پھر وہ بیٹے کے چہرے پر پسینے کی بوندے اور آنکھوں میں سرخی دیکھ کر رو پڑی۔اور اس کی ٹھوڑی پکڑ کر

پوچھا، ''خدا کے لیے کچھ تو بتاؤ، راشد کیا بات ہے، کیا ہو گیا ہے تمہیں۔!؟''

اس نے ماں کی جانب سہمی ہوئی نظروں سے دیکھا، اور پھر بجلی کے بلب کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لرزتی آواز میں کہا، ''یہ سرخ بلب بند کر دو ماں۔''

ماں اور اس کی بیوی حیرت زدہ ایک دوسرے کو دیکھتے رہ گئے۔کیوں کہ راشد جسے سرخ لائٹ کہہ رہا تھا در اصل وہ دودھیا بلب تھی۔

ماہر ڈاکٹروں، سیانوں اور نفسیاتی معالجوں سے اس کا کافی علاج کرایا گیا لیکن گجرات فساد کی خوں ریزی کے دردناک مناظر اس کے ذہن سے مٹ نہ سکے اور

معروف نیشنل شوز کمپنی کا قابل منیجر راشد عمر گھر گرہستی چلانے کے بھی قابل نہ رہ سکا۔بیوی اپنے شوہر کے جیتے جی بیوہ اور بیوہ ماں اکلوتے بیٹے کے غم میں پاگل ہو گئی۔پندرہ سال کا طویل عرصہ بیت گیا۔راشد کو آج بھی ہر طرف لہولہو منظر دکھائی دیتا ہے۔!!

www.urduchannel.in

مِٹّی کا رشتہ

تشدد اور عصمت دری جیسے مسائل سے ملک جوجھ رہا تھا۔ مخالف جماعتیں حکومت کے خلاف احتجاج کر رہی تھیں، اقلیتی طبقے اپنے مطالبات کے لیے ریلیاں نکال رہے تھے۔ شر پسند تنظیمیں فرقہ پرستی کا صور پھونک رہی تھیں اور اخبارات چٹ پٹی خبریں شائع کر کے ان حالات میں دھنک رنگ بھر رہے تھے۔ مگر دیش کی تہذیب وتمدن کے پروردہ لوگ حسبِ دستور اپنے اپنے کاروبار میں لگے ہوئے تھے۔

میں ڈیوٹی سے گھر لوٹ رہا تھا۔ حسن اتفاق گاڑی میں بھیڑ نہ ہونے کی وجہ سے مجھے ونڈو سیٹ مل گئی تھی۔ دوسرے مسافر بھی اطمینان سے اپنی پسند کی جگہ تلاش کر بیٹھ رہے تھے۔ البتہ پلیٹ فارم پر ہمیشہ کی طرح، وڈا پاو، چائے پان اور اخبار فروشوں کا شور برپا تھا۔ مقابل کی سیٹ پر میرے سامنے ایک بڑھیا فکر میں ڈوبی اداس بیٹھی ہوئی تھی۔ بڑھیا کے زانو پر سر رکھ کر ایک نوجوان مگر نحیف سی عورت بے سدھ لیٹی ہوئی تھی۔ اس کے پہلو میں شیر خوار بچّہ آنکھیں موندے انگوٹھا چوس رہا تھا۔ بچے کی بھنوؤں کے درمیان لگا مہین سیاہ نقطہ اس کے ہندو ہونے کی نشاندہی کر رہا تھا۔

گاڑی چلنے لگی اس وقت ایک مسلم جوڑا ہنستے بولتے کمپارٹمنٹ میں داخل ہوا اور سیدھے میرے بازو کی خالی نشستوں پر آ کر بیٹھ گیا۔ وہ دونوں تنومند دلکش شخصیت کے مالک تھے۔ ان کا ڈیڑھ دو سالہ بچّہ بھی انہیں کی طرح خوب صورت اور صحت مند تھا۔ گرمی کی شدت سے گھبرا کر خاتون برقعے سے بے نیاز ہوگئی تھی مگر دوپٹہ بڑے سلیقے سے اوڑھ لیا تھا۔ اپنا سامان جماتے ہوئے بھی ان کی گفتگو جاری تھی۔

گاڑی اپنی رفتار اختیار کر چکی تھی اور سیٹی بجا بجا کر اپنی تیز رفتاری کا اعلان کر رہی تھی۔ میں کھڑکی سے قدرتی مناظر دیکھ کر لطف اندوز ہو رہا تھا۔ دفعتاً سامنے کی سیٹ پر بچے نے رونا شروع کیا اور ہاتھ پاؤں چلانے لگا۔ بڑھیا نے اسے اٹھا کر اپنی بانہوں میں لے لیا، لیکن بچہ روتا ہی رہا۔ بڑھیا نے اسے بہتیرا تھپتھپایا، پچکارا مگر وہ اس قدر تلملا کر رونے لگا کہ ڈبے میں سوار سبھی مسافروں کی توجہ کا مرکز بن گیا۔ ''ماں جی، شاید بچے کو بھوک لگی ہے۔ اس کی ماں کو جگا دیجیے۔'' مسلم خاتون نے اپنائیت سے کہا، ''بیٹا وہ بیمار ہے۔ اس نے دو روز سے کچھ کھایا نہیں بچے کو کیا دودھ پلائے گی۔'' بڑھیا نے درد بھرے لہجے میں جواب دیا۔

بچہ مسلسل روئے جا رہا تھا اور لحہ بہ لحہ اسکی بے چینی بڑھتی جا رہی تھی۔ اس کی حالت دیکھ کر مسلم خاتون کا دل بھر آیا۔ اس نے سوالیہ نظروں سے اپنے میاں کی آنکھوں میں دیکھا اور پھر کہا۔ ''ماں جی اگر آپ کو اعتراض نہ ہو تو بچے کو میں اپنا دودھ۔۔۔!؟'' ''کیوں نہیں بیٹی یہ تو بڑا اپکار ہوگا تمہارا۔'' بڑھیا نے بے تابی سے لرزتی آواز میں جواب دیا۔ خاتون نے اپنا بچہ شوہر کے حوالے کیا اور اس روتے بلکتے بچے کو گود میں لے کر دودھ پلانے لگی۔ بچہ بے تابانہ اپنی بھوک مٹانے لگا اور خاتون محبت سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرنے لگی جیسے وہ بچہ بھی اسی کے جسم سے ٹوٹ کر نکلا ہو۔ بچے کو دودھ پیتا دیکھ کر اس کا اپنا بچہ

www.urduchannel.in

بھی دودھ کے لیے مچل اٹھا۔اس حالت پر میاں نے بیوی کو تمسخر بھری نظروں سے دیکھ کر مسکرادیا۔خاتون نے جواباً فاتحانہ انداز سے دیکھتے ہوئے بڑے طمطراق سے اپنے بچے کو لیا،اپنی آغوش پھیلائی اور دوسری طرف اسے بھی دودھ پلانے لگی۔

دونوں بچے بڑے سکون سے دودھ پی رہے تھے۔خاتون کی آنکھوں سے گہری ممتا چھلک رہی تھی اور اس کے چہرے پر بے حد کیف وسرور تھا۔اسے دیکھ کر ایسا لگ رہا تھا،گویا اس کے دامن میں کون و مکاں کی دولت سما گئی ہو۔یہ منظر دیکھ کر بڑھیا کی آنکھیں اشکبار تھیں،میرا دل خوشی سے جھوم رہا تھا اور میاں جو پالتی مار کر اخبار کا جائزہ لے رہے تھے،دل ہی دل میں اپنی بیوی کی عظمت پر نازاں تھے۔

''مندر مسجد مسئلہ پھر گرمایا'' اچانک میری نظر اخبار کی شاہ سرخی پر جا پڑی۔ابھی میں اس متنازع موضوع پر سوچ ہی رہا تھا کہ ایک بچے کے پیشاب کی دھار فوارے کی طرح ہوا میں اڑتی ہوئی اخبار کی شاہ سرخی پر آ گری۔!! ☆☆

''لاشوں کا سوداگر''

جیل کے مین گیٹ سے باہر نکل کر اس نے کھلی فضا میں ایک لمبی سانس لیتے ہوئے اپنے اندر تازگی پیدا کی اور گردنواح پر ایک طائرانہ نظر ڈالی۔پاکٹ سے سگریٹ نکال کر جلائی اور شانِ بے نیازی سے دھواں اڑاتا ہوا۔اپنے مکان کی طرف چل پڑا۔راستے میں جگہ جگہ لٹی ہوئی دکانیں اور جلی ہوئی عمارتیں اپنی بربادی کی داستانیں سنا رہی تھیں۔اور وہ بھی فساد کی روداد سننے کے لیے بے چین تھا،مگر پہلے وہ سیدھا اپنے گھر پہنچا۔

اسے دیکھتے ہی ماں کی آنکھیں فرطِ مسرت سے چمک اٹھیں۔بہن کا چہرا خوشی سے کھل گیا۔پیاسی مامتا نے چند ہی لمحوں میں اس کی طبیعت اور روح کو محبت سے سرشار کر دیا۔اور بہن کے ہاتھ کی چاہت بھری ایک پیالی گرم گرم چائے سے اس کی جیل کی بوریت اور تھکن بھی جاتی رہی۔جیل جانا اس کے لیے پریشانی کا باعث نہیں تھا کہ وہ کئی بار جیل جا چکا تھا۔کبھی غنڈہ گردی اور کبھی پڑوسیوں سے لڑائی کی بنا پر۔پچھلی مرتبہ وہ ٹیکسی میں لاش لے جاتے ہوئے پکڑا گیا تھا۔دو سال تک جیل میں رہا۔قاتل کے مل

www.urduchannel.in

جانے کے سبب وہ بچ گیا ورنہ عمر بھر جیل میں پڑا رہتا۔اس بار چوری کے جرم میں اسے چھ ماہ کی سزا ہوئی تھی۔اس کے جیل جانے کے بعد اس کی بہن کی شادی ایک متوسط گھرانے میں ہوگئی تھی۔اور اس طرح اس کی یہ سب سے بڑی فکر دور ہوگئی تھی۔اس نے ماں سے بہن کے رشتے اور شادی کی مختصر روداد سنی۔اور اپنی ٹیکسی لے کر ریلوے اسٹیشن کی طرف نکل پڑا۔

اسٹیشن پہنچ کر اس کی ملاقات اپنے ایک ہم پیشہ ساتھی سے ہوئی۔اس نے بتایا کہ فساد کی آگ بظاہر ٹھنڈی ہو چکی ہے اور دو روز ہوئے شہر میں امن آشتی کا چرچا ہے لیکن یہ آگ اندر ہی اندر دہک رہی ہے۔فرقہ پرست گروہ کی جانب سے مخالف فرقہ کے آدمی کو اغوا کرنے کا ایک ہزار روپے معاوضہ مل رہا ہے۔بھائی لوگ اس موقعے کا فائدہ اٹھا رہے ہیں۔مزید گفت وشنید کے بعد اس نے ماحول کا جائزہ لیا۔اور پھر اپنے شکار کی تلاش میں لگ گیا۔

دن کے تین بج رہے تھے۔اب تک وہ اپنے ساتھی کی مدد سے ایک مرد اور ایک عورت کو فرقہ پرست گروہ کے اڈے پر چھوڑ آیا تھا اور دو ہزار کی کمائی کر چکا تھا۔اب اسے بھوک اور تھکن ستا رہی تھی۔اس نے گھر جانے کے ارادے سے ٹیکسی اسٹارٹ کی ہی تھی کہ ایک پروجیہ نوجوان نے نہایت شستہ لہجے میں اسے متوجہ کیا۔اس نے نوجوان کو سرتا پا بغور دیکھا۔اسی وقت اس کے ساتھی نے اسے اشارہ کیا۔چنانچہ نوجوان کی بات پر دھیان دینا اس کے لیے ضروری نہیں تھا، کیوں کہ یہ نوجوان اب اس کا تیسرا شکار تھا۔اس کے ساتھی نے نوجوان کو بٹھانے کے لیے کسی وفادار نوکر کی طرح پچھلی نشست کا دروازہ کھول دیا۔اور اس نے اسٹیرنگ گھما کر سیٹی بجاتے ہوئے اکسیلیٹر دبا دیا۔چند ہی لمحوں میں ٹیکسی ممبئی کی مصروف شاہراہ پر راستہ بناتی ہوئی ہوا سے باتیں کرنے لگی۔فلک بوس عمارتیں اور عالیشان دکانیں یکے بعد دیگرے گزرتی گئیں اور پھر وہ منڈی بھی آ گئی جہاں یہ بیوپار ہو رہا تھا۔فرقہ پرست نوجوان پر درندوں کی

طرح ٹوٹ پڑے اور اس کا کام تمام کر دیا۔

اس نے اپنے ساتھی کو طئے شدہ حصہ ادا کیا۔اور گھر کی راہ لی۔گھر پہنچ کر اس نے ہاتھ منہ دھویا۔بہن نے فوراً اس کے لیے کھانا چُن دیا۔پہلا لقمہ لیتے ہوئے اچانک ہی اس کی نظر دیوار پہ آویزاں اس خوش نما تصویر سے ٹکرائی جو بہن کی شادی کے موقع پر لی گئی تھی۔وہ تیزی سے اٹھ کر تصویر کے قریب پہنچا۔اس کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں، پاؤں تلے سے زمین نکل گئی اور مجسمے کی طرح تصویر کو تکتا ہی رہ گیا۔ابھی ابھی وہ جس شخص کو موت کے گھاٹ اتار آیا تھا وہ کوئی اور نہیں، اس کی بہن کا شوہر تھا۔!! ☆☆

www.urduchannel.in

فرق

بھکارن کے مرنے کی خبر بڑی سرعت کے ساتھ ساری جھونپڑ پٹی میں پھیل گئی تھی۔ایک خیمہ نما جھونپڑی میں جھلنگا کھاٹ پر اس کی لاوارث لاش پڑی ہوئی تھی۔

اور اس کی آغوش میں اس کا شیر خوار بچہ تھا جو آنکھیں موندیں انگوٹھا چوس رہا تھا۔بھکارن کا بے جان چہرہ ایسے لگ رہا تھا جیسے وہ کڑی دھوپ کا لمبا سفر طئے کر کے ٹھنڈی گھنی چھاؤں میں گہری نیند سو رہی ہو۔جھونپڑی کے قریب جمع لوگ بھکارن کی موت پر اظہارِ افسوس کر رہے تھے۔

بے چاری اپاہج حالات کی ماری، شوہر کی موت کے بعد مصیبت کے دن کاٹتے ہوئے بھوکو مرگئی۔بھکارن کی بوڑھی پڑوسن نے لرزتی آواز میں بین کیا۔''دیکھو! بچہ کیسا خوب صورت اور صحت مند ہے۔''کسی نے درد بھرے لہجے میں کہا۔''خوب صورت۔!''منحوس ہے، منحوس، کم بخت کے پیدا ہونے کے بعد سے بے چاری بیمار رہنے لگی تھی

برجستہ ایک عورت ناک سکیڑ کر بچے کی طرف اشارہ کر کے بولی۔ایک باریش نوجوان اونچی آواز میں مجمع

سے مخاطب ہوا،''لیکن اب اس کے کفن دفن کا کیا کریں بھائیو۔!؟''ارے چلو، چل کر امام صاحب سے بات کرتے ہیں۔''ایک دوسرے نوجوان نے فوراً جواب دیا۔

بچے نے کچھ ہلچل کی اب اس کے منہ سے انگوٹھا چھوٹ چکا تھا۔وہ رونے لگا۔''مگر اب اس بچے کا کیا ہوگا!؟''ایک بزرگ نے سوال کیا اور عورتوں کی جانب دیکھنے لگے۔تھوڑی دیر تک خاموشی چھائی رہی۔سب ایک دوسرے کا منہ دیکھتے رہے۔اور پھر چہ میگوئیاں شروع ہوگئیں۔بچہ بھوک سے بے تاب ہوکر ماں کے سینے سے چمٹنے کے لیے تڑپ رہا تھا۔وہ روئے جا رہا تھا اور لمحہ بہ لمحہ اس کی بے چینی بڑھتی جا رہی تھی۔اس معصوم کی تلملاہٹ انسانیت کے نام پر دو گھونٹ دودھ کی التجا کر رہی تھی۔مگر وہاں موجود ہر کس و ناکس بچے کے مستقبل پر فکر انگیز تبصرہ کرنے میں مشغول تھا۔حتیٰ کہ شیر خوار بچوں والی مائیں بھی جن کے سینے دودھ سے بھرے ہوئے تھے، جو، اس روتے بلبلاتے اس بچے کی بھوک مٹا سکتی تھیں۔اپنے بچوں کو سینے سے لگائے بس تماشہ دیکھ رہی تھیں۔

اس وقت، یک لخت میرے ذہن میں اس کُتیا کا تصور ابھر آیا جس کا دودھ اس بچوں کے ساتھ ساتھ ایک خنزیر کا بچہ بھی پی رہا تھا۔مگر کتیا کوئی مزاحمت نہیں کر رہی تھی، بلکہ اس کی آنکھوں سے گہری ماتا چھلک رہی تھی، جیسے وہ خنزیر کا بچہ بھی اسی کی کوکھ سے نکلا ہو۔!! ☆☆

www.urduchannel.in

چاہت

بستی سے دور کھلے میدان میں حدِ نگاہ تک بس وہ ایک ہرا بھرا تناور پیڑ تھا۔جس کی گھنی ٹھنڈی چھاؤں میں کئی پرندے آ کر چہچہاتے اور ایک ڈال سے دوسری ڈال پر پھدکتے رہتے۔صبح وشام چڑیوں کی چہکار سے پیڑ گونج اٹھتا تھا۔دوپہر کے وقت جانوروں کے ریوڑ بھی پیڑ کے قدموں میں آ کر بیٹھ جاتے ۔لیکن جب موسمِ خزاں میں پیڑ کا لباس مسک جاتا اور اس پر ویرانی برسنے لگتی۔ پرندے اڑ کر دور کسی سبز علاقے میں ہجرت کر جاتے اور جانور بھی دوسری جگہ اپنا ٹھکانا بنا لیتے۔ پیڑ مایوس ہو کر اپنے آپ میں سمٹ کر رہ جاتا۔تب اس کی آغوش میں بسی ہوئی کویل سے اس کی اداسی دیکھی نہ جاتی اور وہ اپنی سریلی آواز میں نغمے بکھیرنے لگتی۔کویل کی مدھر کوک سن کر یکلخت پیڑ کی اداسی پگھل سی جاتی اور وہ مسرور ہو کر خوشی سے جھوم اٹھتا۔

پیڑ سے کویل کا یہ جذباتی رشتہ بڑا دیرینہ تھا۔خزاں اور بہار کے ان گنت موسم کویل نے اس تنہا پیڑ کی آغوش میں بتا دیے تھے۔ پیڑ کا وجود کویل کی کوک سے اس طرح ہم آہنگ تھا جیسے اس کے بغیر اس کا

اپنا وجود نہ ہو۔غرض پیڑ اپنی زندگی میں نہایت مطمئن اور خوشحال تھا کہ اس کی زندگی میں ایک سانحہ پیش آیا۔ایک صبح جب کالے بادل برس کر چھٹ گئے اور سورج نے اپنی سنہری چادر زمین پر پھیلائی، پیڑ کو اپنے پہلو میں ایک لطیف اور انوکھی گدگداہٹ محسوس ہوئی پہلی بار اس نے جھک کر اپنی جڑوں کی طرف دیکھا۔ وہ چندن کا نوخیز پودا تھا۔ چندن کو اپنے پہلو میں دیکھ کر پیڑ بہت خوش ہوا۔ پروان چڑھتے چندن کے پودے سے ہر دم پھوٹتی بھینی بھینی خوشبو پیڑ کا دل لبھانے لگی۔جب اس کی نرم نازک پتّیاں ہوا کے جھونکوں سے پیڑ کے تنے کو بار بار مس ہوتیں، پیڑ کی رگوں میں پر کیف لہریں دوڑ جاتیں اور لطف وانبساط کی انوکھی لذت اسے بیخود کر دیتی۔ چندن کی خوشبو اور کشش روز بروز بڑھتی گئی اور پیڑ اس چاہت میں اسیر ہوتا گیا۔پیڑ کی گھنی رفاقت،قریب بہتے ہوئے جھرنے کی رغبت پہاڑ کی اوٹ سے ابھرتے سورج کی گرمی، نیلگوں آسمان کی وسعتوں میں اڑتے پرندوں کی ڈاریں، کائنات کی ایسی نیرنگیوں نے چندن کے پودے کو نت نئی امنگیں عطا کیں اور دیکھتے ہی دیکھتے چندن کا دھان پان سا پودا ایک تناور پیڑ کی شکل اختیار کر گیا۔

چندن کی ڈالیاں پیڑ کی ڈالیوں سے ہم آغوش ہو گئی تھیں۔اس کی رگ رگ میں چندن کی خوشبو رچ بس گئی تھی اور پتّا پتا مہک اٹھا تھا۔پیڑ کے شب و روز بڑے ہی رنگین اور پر لطف گزر رہے تھے۔لیکن یہ ہم آہنگی طول نہ پکڑ سکی کیونکہ پیڑ کے نصیب میں یہ عیش ونشاط کی گھڑیاں بہت کم لکھی تھیں۔ایک سوداگر نے پیڑ کے مالک کو منہ مانگی قیمت دے کر چندن کو خرید لیا اور اسے پیڑ کی آغوش سے کاٹ کر لے گیا۔ یہ سانحہ پیڑ پر قیامت بن کر ٹوٹا۔ وہ تڑپ اٹھا۔ جیسے ہزاروں آریاں اس کے اپنے وجود پر چل گئی ہوں۔ چندن کے بغیر اسے اپنے اندر گہرا خلاء محسوس ہونے لگا اور کائنات سونی سونی اور بے رنگ نظر آنے لگی۔ وہ کھویا کھویا اور اداس رہنے لگا۔

www.urduchannel.in

وقت گزرتا گیا،مگر پیڑ چندن کی جدائی کا صدمہ نہیں بھول سکا۔اس غم میں اس کی ٹہنیاں جھک گئیں۔پتّے زرد ہوکر جھڑ گئے اور وہ اندر ہی اندر سوکھ کر رہ گیا۔اب پیڑ کے جیون میں گھنی چھاؤں تھی نہ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوائیں، ماحول میں ویرانی سی پھیل گئی تھی۔پرندے اس کے خشک نکیلے وجود سے کترا کے نکل جاتے۔چڑیوں نے بھی دور کسی کنج میں اپنا بسیرا کرلیا تھا۔کوئی جانور ایک پل کے لیے بھی اس کے پاس نہ ٹھہرتا۔پیڑ کی اداسی نے گویا سارے ماحول کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا۔سناٹا اور ویرانی پیڑ کا مقدر بن گئی تھی۔حدِ نگاہ تک پھیلے اس میدان کے بیچ اس کا وجود کسی آسیب کی طرح دکھائی دینے لگا تھا،مگر پیڑ پر بسی ہوئی کویل اپنا دیرینہ رشتہ بنائے ہوئے تھی۔وہ اب بھی اپنی بوڑھی آواز میں پیڑ کا دل بہلانے کی کوشش کرتی ہے۔!!☆☆

بھکاری

میں تیار ہوکر ڈیوٹی جانے لگا تو بیوی نے مجھے پانچ روپئے کی ریز گاری تھماتے ہوئے کہا،’’دعاؤں سے بلائیں اور حادثے ٹل جاتے ہیں،فقیروں کو خیرات کرتے جائیں۔میں نے مسکرا کر بیوی کے نیک جذبے کی پزیرائی کی اور سلام کر کے گھر سے نکل پڑا۔

اسٹیشن پہنچا تو گاڑی آنے میں دس پندرہ منٹ وقت تھا۔ٹائم پاس کے لیے موبائل نکال کر میں واٹس ایپ دیکھنے لگا۔اس وقت اچانک ہی مجھے بھکاریوں کی عدمِ موجودگی کا احساس ہوا کہ اب تک تو کوئی نہ کوئی بھکاری میرے سامنے ہاتھ پھیلائے کھڑا ہوجاتا۔میں نے پلیٹ فارم کا جائزہ لیا تو بمشکل ایک دو بھکاری نظر آئے۔جب کہ یہاں مسافروں کے درمیان بھکاری جابجا دکھائی دیتے تھے۔ اورا نھیں آتے جاتے ان گنت مسافروں سے گزر بسر کے لیے بہت کچھ مل جاتا تھا، کیونکہ قدرت نے محتاج اور ضرورت مندوں کے لیے سخی اور مہربان لوگ بھی پیدا کیے ہیں۔جنھیں خیرات دینے میں بڑی راحت ملتی ہے۔

www.urduchannel.in

میں کچھ آگے بڑھا تو پلیٹ فارم کینٹن پر ناشتہ کرتے ہوئے مسافر کے سامنے ایک بھکاری ہاتھ پھیلائے گڑگڑاتا دکھائی دیا۔مسافر نے جب اسے اپنی پلیٹ سے ایک کچوری اٹھا کر دینا چاہا تو اس نے انکار میں گردن ہلاتے ہوئے کہا،''پیسے چاہیے ساب۔''مسافر نے بگڑ کر تلخ لہجے میں جواب دیا،''پیٹ بھرنا ہے یا جیب!''مسافر نے پہلے سے زیادہ عاجزانہ لہجے میں التجا کی،''میری بیٹی بیمار ہے ساب،اس کے علاج کے لیے پیسوں کی جرورت ہے۔''خستہ حال بھکاری کی آواز آنسوؤں سے بھیگ رہی تھی۔تب مسافر نے اپنی جیب ٹٹولی اور دو روپئے کا سکّہ اس کی میلی ہتھیلی پر رکھ دیا۔اس کی بے بسی دیکھ کر میرا دل بھر آیا تھا۔آگے بڑھ میں نے بھی اسے بیوی کی دی ہوئی ریزگاری دے دی۔

دوسرے دن جب میں اسٹیشن پہنچا تو گاڑی ایک گھنٹہ لیٹ تھی،اس لیے پلیٹ فارم کے ایک گوشے میں جہاں قدرے سکون تھا۔بینچ پر بیٹھے میگزین پڑھ رہا تھا۔اچانک کسی کی تیز کرخت آواز سن کر میں چونک پڑا اور بے ساختہ پیچھے مڑ کر دیکھا۔پارسل روم کیا آہنی جالی کے پاس (R.P.F) کانسٹبل ایک بھکاری کو ڈانٹ رہا تھا:''کیوں بے سالے حرام خور،کل شام چپکے سے نکل کر دن بھر کی ساری کمائی خود ہی ہڑپ کر کر گیا۔اسٹیشن سے باہر نکلنا ہے کیا۔!؟''نہیں،نہیں مائی باپ،ماپ کردو،بھول ہوگئی۔''بھکاری نے فوراً اپنی میلی کچیلی جیب سے پانچ کا نوٹ اور کچھ ریزگاری نکال کر کانسٹبل کے پھیلے ہوئے ہاتھ پر رکھتے ہوئے کہا۔

یہ منظر دیکھ کر میرے وجود میں کڑواہٹ سی پھیل گئی۔اور مجھے سمجھنے میں دیر نہ لگی کہ پلیٹ فارم بھکاریوں کی تعداد اس قدر کم کیوں ہوگئی ہے۔!!☆☆

آخری قبر

مکوہ پہاڑ کے دامن میں بسے ایک ایسے گاؤں کا باشندہ تھا، جہاں روزگار کے ذرائع بہت کم تھے۔قریب کے جنگل سے حاصل ہونے والی اشیاء پر ہی اکثر لوگوں کی روزی کا دارومدار تھا۔کچھ لوگ کھیتی باڑی اور کچھ پیشہ ورانہ کام کرتے تھے۔اس کا موروثی کام تھا،گورکنی۔لیکن چونکہ روزانہ اس کام کا ملنا ممکن نہ تھا۔سو چھوٹے موٹے متفرق کام کر کے وہ اپنا گزر بسر کیا کرتا تھا۔

بے روزگاری کے سبب چند دنوں سے اس کی زندگی بڑی تنگ دستی میں گزر رہی تھی۔ساگ پات اور روکھی سوکھی کھا کر اس کے بیوی بچے بس اپنی بھوک مٹا رہے تھے۔لیکن آج دو روز ہوئے اس کے گھر چولہا نہیں جلا تھا۔وہ بے حد فکر مند اور پریشان تھا کہ کیا کریں۔اس نے سوچا ''اگر کسی کی موت ہوجائے تو بچوں کے لیے دال روٹی کا انتظام ہوجائے''لیکن دوسرے ہی پل اس نے اس خیال کو اپنے ذہن سے جھٹک دیا مگر پھر بھی اسکا دل ملامت کرنے لگا تھا اور اس کے وجود میں کڑواہٹ سی پھیل گئی۔ اس نے اپنے ہاتھوں سے چہرہ ڈھانپ کر استغفراللہ پڑھی۔لیکن شاید قدرت نے اس کے دل کی آواز سن

www.urduchannel.in

لی تھی۔اسی وقت کسی نے اسے پکارا،''غفور بھائی،غفور بھائی۔!''وہ تیزی سے گھر کے باہر نکلا۔''غفور میاں،شرافت علی کا انتقال ہوگیا ہے۔''

''شرافت علی۔!؟

''ہاں،کرانہ دکان والے۔''

اسے ایک دھکا سا لگا اور وہ خیالوں میں ڈوب گیا۔شرافت علی بڑے شفیق اور مہربان آدمی تھے۔انھوں نے کئی بار بُرے وقت میں اس کی مدد کی تھی۔

''کیوں کیا ہوا۔!؟''

''بڑے نیک آدمی تھے،اللہ مغفرت کرے۔''

''آپ قبر بنائیے،انشاءاللہ عصر کی نماز کے بعد تدفین ہوگی۔''

اس نے کھدائی کا سامان اٹھایا،اور بیوی سے کہا،''بچوں کو سنبھالنا میں شام کو دال آٹا لیتا آؤں گا۔''وہ تیزی سے قبرستان پہنچا اور بتائی ہوئی جگہ پر کھدائی شروع کردی۔وہ تیس سال سے قبریں کھودرہا تھا،مگر آج قبر کھودنا اسے کافی دشوار لگ رہا تھا۔لیکن اس کی آنکھوں کے سامنے اپنے بیوی بچوں کے،حسرت و یاس میں ڈوبے ہوئے چہرے ابھر آئے اور بھوک سے بے تاب بچوں کے تصوّر نے اس کے بازوؤں میں سنگلاخ زمین چیرنے کا حوصلہ پیدا کردیا۔

سورج آگ برساتا رہا،زمین بھاپ اگلتی رہی اور وہ قبر کھودتا رہا۔سانس پھول جاتی تو رک جاتا۔کبھی بیٹھ جاتا اور پانی پی کر پھر۔۔۔،قبر تقریباً مکمل ہوچکی تھی۔لیکن قبر کی دیوار سے باہر نکلا ہوا چٹان نما مخروطی پتھر وہ توڑ نہیں پایا تھا۔اس کی ہمّت جواب دے چکی تھی مگر جب میّت قبرستان پہنچی،وہ گھبرا کر کھڑا ہوگیا اور پھر اس بھاری بھرکم پتھر کو توڑنے کی کوشش کرنے لگا۔

شام کے پانچ بج رہے تھے،جنازہ قبر کے ایک بازو رکھا ہوا تھا اور لوگ قبر کو گھیرے کھڑے تھے۔وہ پہلو بدل بدل کر چٹان پر ضربیں لگا رہا تھا۔کدال چلاتے چلاتے اس کے ہاتھ شل ہوگئے تھے اور آنکھوں میں اندھیرا سا چھانے لگا تھا۔پسینہ پوچھنے کے بہانے اس نے امداد طلب نظروں سے اوپر کھڑے ہوئے لوگوں کی جانب دیکھا،لوگ اسے سنگی بتوں کی طرح دکھائی دیے مگر جب اس کے لرزتے ہاتھوں کے وار ادھر اُدھر پڑنے لگے وہ اسے ہدایتیں دینے لگے۔''غفور بھائی ذرا ٹھیک سے نشانہ لگایئے۔''،''ارے شاید غفور میاں کی بینائی کمزور ہوگئی ہے۔''اور پھر وہ پتھر لوگوں کی گفتگوں کا موضوع بن گیا۔

کمزوری اور فاقہ کشی کے سبب اسکا کھوکھلا جسم کانپنے لگا اور اس پر غشی طاری ہونے لگی۔اسے یوں محسوس ہونے لگا جیسے وہ قبر کی تاریک گہرائی میں دھنستا چلا جارہا ہو۔''ذرا زور سے۔!!''کسی کی تیز کرخت آواز اس کی سماعت سے ٹکرائی۔اس نے اپنی تمام تر قوت یکجا کر کے کدال سر سے اوپر اٹھا کر وار کیا۔پتھر ٹوٹ گیا اور وہ اس آخری وار کے ساتھ ہی قبر میں ڈھیر ہوگیا۔☆☆

www.urduchannel.in

''مہکتے رشتے''

پچاس پچپن برس کی عمر میں بیوی کی موت مرد کو ایک ایسے المناک موڑ پر چھوڑ دیتی ہے کہ اسے تنہا اپنی بکھری زندگی سمیٹ کر جینا محال ہوتا ہے۔ نہ وہ اپنے ماضی کو بھول پاتا ہے نہ اسے مستقبل کا تصوّر ہوتا ہے۔ اکیلے پن کا دکھ اور اس وقت کی ڈوبتی ابھرتی خواہشیں زندگی کو مضطرب کر دیتی ہیں۔ پروفیسر محمد طاہر خانصاحب ایسے ہی حالات سے دوچار تھے۔

خانصاحب کو ہر معاملے میں بیوی کی رفاقت حاصل تھی۔ تعلیم یافتہ، باذوق شریکِ حیات کی محبت اور چاہت سے ان کی زندگی باغ و بہار اور گھر جنت تھا۔ خانصاحب اچھے تن وتوش کے مالک تھے۔ ان میں جوانوں سی تیزی اور کراری تھی۔ اعلیٰ اخلاقی قدروں اور خاندانی وضعداری کے سبب اپنے حلقہء احباب اور معاشرے میں انھیں ایک خاص مقام حاصل تھا۔ لیکن بیوی کی اچانک موت سے انہیں دھچکّا لگا۔ اور ٹوٹ کر رہ گئے۔ نہ وہ اپنے ساتھیوں سے ملتے تھے نہ ہی ملازمت کے کاموں میں ان کی طبیعت لگتی تھی۔ بس اداس اور کھوئے کھوئے سے رہتے انہیں اذان کی آواز تک محسوس نہ ہوتی جب کہ

پہلے اذان سنتے ہی وہ عذرا سے کہتے، ''بیٹی وضو کے لیے پانی رکھ دو۔!

خانصاحب کی یہ حالت دیکھ کر ان کے دوستوں نے انہیں رائے دی، ''خانصاحب، آپ کی اہلیہ کو گزرے ایک ڈیڑھ سال کا عرصہ بیت چکا ہے۔ اب آپ کسی نیک خاتون سے نکاح کر لیں کیونکہ آدمی کو جوانی سے زیادہ بڑھاپے میں بیوی کی ضرورت ہوتی ہے۔ آپ چاہیں تو اس معاملہ میں ہم لوگ خدمت کے لیے حاضر ہیں۔'' مگر خانصاحب خاموش رہے۔ ان کے چہرے پر ایسا کوئی تاثر نہیں ابھرا جس سے ان کے من کی بات سمجھ میں آتی۔

بیوی کے بغیر خانصاحب کی زندگی میں ایک خلا سا پیدا ہو گیا تھا اور بلاشبہ انہیں زندگی کے اس موڑ پر ہم سفر کی ضرورت بھی تھی۔ رات میں جب بچے سونے کے لیے اپنے کمروں میں چلے جاتے، وہ اپنے کمرے میں تنہا رہ جاتے۔ اس وقت دبے قدموں بیوی کی یادیں گھر میں داخل ہو جاتیں۔ در و دیوار گھر کی ہر شئے سرگوشیاں کرنے لگتی اور سارا کمرہ پر مسرت لمحوں کی خوشبو سے مہک اٹھتا۔ خانصاحب خوابوں خیالوں کی حسین وادی میں گُم ہو جاتے اور جب یہ طلسم ٹوٹتا، وہ دل برداشتہ ہو جاتے۔

خانصاحب کے بچے اپنے والدین کی طرح ذی فہم اور مخلص تھے۔ عذرا دسویں جماعت پاس کر چکی تھی اور آگے پڑھنا چاہتی تھی۔ شاہد فارمیسی کر رہا تھا۔ ان کی مرحوم بیٹی کی آخری نشانی پانچ سالہ آفرین بھی انہی کے زیرِ سایہ پرورش پا رہی تھی۔ وہ ان سب کے بارے سوچ کر گہری فکر میں ڈوب جاتے۔ عذرا اور شاہد اپنے ابو کی ایسی حالت دیکھ کر بے حد فکر مند تھے۔ دونوں بھائی بہن انہیں خوش اور مستعد دیکھنا چاہتے تھے۔ بہر حال وہ اپنی امی کی طرح اپنے ابو کا پورا خیال رکھتے اور انہیں خوش رکھنے کی مقدور بھر کوشش کرتے لیکن انہیں خانصاحب میں پہلی سی کوئی بات دکھائی نہیں دیتی تھی شاہد کو جب اپنے معاشرے میں ایسے لوگ دکھائی دیے جنھوں نے ڈھلتی عمر میں ایک نئی زندگی کا آغاز کیا ہے اور وہ اپنی گھر

www.urduchannel.in

گرہستی میں خوش اور مطمئن ہیں تو اسے احساس ہوا کہ ابو کے لیے بھی ایک ہم سفر ضروری ہے لیکن وہ جانتا تھا کہ ابو کے خیالات اور نظریات عام لوگوں سے الگ ہیں۔ وہ اس بات پر راضی نہ ہونگے سو، اس نے اس ضمن میں اپنی بہن عذرا سے مشورہ کیا۔

اور پھر ایک روز دوپہر میں جب خانصاحب بستر پر لیٹے کسی رسالے کی ورق گردانی میں مشغول تھے، شاہد اور عذرا ان کے کمرے میں پہنچے۔ دونوں بچوں کو اس طرح اچانک ایک ساتھ دیکھ کر خانصاحب اٹھ بیٹھے اور بے تابی سے پوچھا، ''کیا بات ہے شاہد، سب ٹھیک تو ہے نا!؟'' ہاں، ابو، اللہ کا فضل و کرم ہے۔'' شاہد نے بڑے ادب سے جواب دیا۔ پھر انھوں نے اپنی نواسی آفرین کے بارے میں پوچھا، جی ابو، وہ صحن میں کھیل رہی ہے۔'' عذرا نے انھیں اطمینان دلایا۔ دونوں بھائی بہن جب خانصاحب کے قریب پلنگ پر بیٹھ گئے، تب وہ سمجھ گئے کہ بچے کوئی خاص بات کرنا چاہتے ہیں۔ انھوں نے دریافت کیا، 'کیا بات ہے شاہد میاں۔؟'' ابو، وہ۔! شاہد ہچکچایا۔ خانصاحب نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھ کر نرمی سے کہا، ''بولو بیٹے، گھبراؤ نہیں۔ کیا کہنا چاہتے ہو!؟'' ابو، دراصل بات یہ ہے کہ ہمیں گھر میں امی کی کمی محسوس ہوتی ہے، گھر سونا سونا لگتا ہے۔ اور پھر ہماری دیکھ بھال کے لیے بھی ماں کی ضرورت ہے اس لیے آپ ہماری خاطر۔۔۔'' خانصاحب نے شاہد کے منہ پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔ اپنے بچوں کے نیک جذبات دیکھ کر ان کی آنکھیں بھر آئیں (جاری) انھوں نے دونوں بچوں کو اپنی بانہوں میں لے کر سینے سے لگالیا اور بولے، ''نہیں میرے بچّو۔! تمہیں ماں کی ضرورت نہیں ہے۔ تمہاری تو اب شادی کی عمریں ہیں۔ میں سمجھتا ہوں تم یہ سب کیوں چاہتے ہو۔'' ان کی آنکھوں سے آنسو چھلک پڑے۔ اپنے آپ پر قابو پا کر چند لمحوں بعد انہوں نے کہا، ''میرے جگر پارو، تمہاری امی میری روح میں سمائی ہوئی ہیں۔ ان کی جگہ کوئی دوسری عورت نہیں لے سکتی۔ مگر تم فکر نہ کرو۔ اب میں تمہیں اس گھر میں کوئی کمی محسوس نہیں ہونے

دوں گا۔ میں تمہاری امی کی یادوں میں تمہاری خوشیوں کے رنگ بھر دونگا۔ اور پھر انہوں نے دونوں بچوں کی پیشانیاں چوم لیں۔

پانچ بج رہے تھے۔ عصر کی اذاں ہو رہی تھی۔ آج اذان کے الفاظ خانصاحب کے کانوں میں رس گھول رہے تھے۔ انہوں نے آواز دی، ''بیٹی عذرا، وضو کے لیے پانی رکھ دو۔!'' خانصاحب کی آواز میں وہی پہلی سی لہک اور ترنگ تھی۔!!

www.urduchannel.in

فریبِ نظر

وہ گروہ اپنے فرائض کی ادائیگی میں نہایت سنجیدہ اور ایماندار تھا اس لئے اُس کی مقبولیت اور عظمت روز بروز بڑھتی گئی نیز افراد کی تعداد میں اضافہ ہوتا گیا۔ گروہ پر عائد فرائض کا حساب لینے والا بظاہر موجود نہیں تھا۔ چنانچہ اُن لوگوں کو اپنے گروہ کے اصولوں پر چلنے کی مکمل آزادی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ ایک مقصد یکساں فکر و نظر اور ایک مرکز پر رہنے کے باوجود رفتہ رفتہ وہ اس طرح دو گروہوں میں بٹ گئے جیسے یہ کوئی فطری امر ہو۔ ان دونوں گروہ میں بنیادی فرق صرف۔ عینک۔ کا تھا، بلکہ ذوں کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کہ عینک ہی ان کے انتشار کا سبب تھی۔

نوارد، دونوں گروہ کے معاملات میں اختلاف دیکھ کر اس شش و پنج میں پڑ گیا کہ کس سمت میں جائے۔ کس گروہ میں شرکت کرے۔۔ کون سا گروہ سیدھے اور سچّے راستے پر گامزن ہے۔ اس کے ذہن میں کئی سوال اُبھر آئے۔ نوارد سنجیدہ اور ذی فہم واقع ہوا۔ ماحول کا جائزہ لینے وہ دونوں گروہ کے افراد سے ملنے لگا۔ ان کے اصول و مقاصد سمجھنے لگا۔ جب وہ میری جانب بڑھا تو میں نے دو قدم آگے بڑھ کر بڑی

گرم جوشی سے اُس کا خیر مقدم کیا۔ اُس نے بھی بڑے خلوص اور عقیدت کا مظاہرہ کیا۔ مجھے اپنے گروہ کی نمائندگی حاصل تھی سو نووارد کی رہنمائی کرنا میرا اخلاقی فرض تھا۔ میں اسے گروہ کے اصول اور طریقہء کار سے روشناس کراتا رہا۔۔ میری باتیں نووارد کے دل میں اترنے لگیں۔۔ وہ اکثر مُجھ سے مِلنے لگا۔ چہل قدمی کے لئے میرے ساتھ آنے لگا۔ اُس کی یہ روش دیکھ کر مُجھے دلی مسرّت ہونے لگی۔

قلیل مدّت میں نووارد ماحول کو بخوبی سمجھ چکا تھا۔ اور اب وہ میرے قریب تر ہو گیا تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ ذہنی طور پر اُس کا جھکاؤ گروہ کی طرف ہو چکا ہے۔ میں اُس کی طبیعت میں استقلال پیدا کرنے کے لئے فطرت کی آغوش میں اس کی ذہن سازی کرتا رہا اور ایک دِن اُسے وہ عینک بھی نذر کر دی جو ہمارے گروہ کی خصوصی پہچان تھی۔ عینک لگنے کے بعد نووارد کا جذبہ اُبھر آیا تھا۔ وہ کبھی گروہ کے اصولو ں پر تبصرہ کرتا اور کبھی مخالف گروہ کی طرز و روش پر تنقید کرتا۔ نووارد کی یہ کیفیت دیکھ کر مجھے یقین ہو گیا کہ اب ہماری تعداد میں ایک اور شخص کا اضافہ ہو جائے گا اور اس خیال سے مجھے اپنے گروہ کا پرچم فضا میں لہراتا دکھائی دے رہا تھا۔

وقت گزرتا رہا، حالات بدلتے رہے۔ سرد گرم موسموں کے تھپیڑوں، کاروباری دشواریوں اور حوصلہ شکن ضرورتوں نے سبق سکھایا اور اُس کے جذبات ماند پڑ گئے۔ وہ مجھ سے دور دور رہنے لگا۔ اُس کا برتاؤ دیکھ کر مجھے ایسا محسوس ہونے لگا جیسے اُس کی یادداشت چلی گئی ہو یا وہ کسی آسیب کی زد میں آ گیا ہو۔ اور پھر ایک روز میں اسے دیکھ کر حیران رہ گیا۔ نووارد دوسرے گروہ کی محفل میں اُن کی رنگین عینک پہنے اس طرح گُھل مِل کر باتیں کر رہا تھا جیسے برسوں کی شناسائی ہو۔ اُس کی اِس غیر متوقع تبدیلی نے مجھے اذیت ناک سوچ میں ڈبو دیا۔

نووارد کے اس طرح مخالف گروہ میں چلے جانے سے میرے ذہن میں کئی سوالات کلبلانے

www.urduchannel.in

لگے۔ مجھے بڑی کوفت ہونے لگی۔ میں نے ہرزاویہ سے دیکھا سوچا اور غور کیا مگر دوسرے گروہ کی اس طلسمی قوت کو سمجھ نہ سکا۔ بالآخر میں اپنے مُرشد عالی کے پاس پہنچا جنہوں نے مجھے یہ عینک عطا کی تھی۔ جن کی صرف ایک بات نے کبھی میرے ذہن کو روشن او قلب و نظر کو منوّر کر دیا تھا۔ اُنہی کی بتائی ہوئی راہ پر چل کر مجھ میں دوسروں کو متاثر کرنے کی خوبی پیدا ہوئی تھی۔ میں نے مُرشد کو تمام روداد کہہ سُنائی۔ مُرشد نے نہایت اطمینان سے جواب دیا،''تم غم نہ کرو۔ یہ ہماری ناکامی نہیں نو وارد کی نادانی اور بدبختی ہے۔''

مُرشد کا جواب سُن کر میری تشفی نہ ہوئی۔ میں نے اپنی بات پر قدرے زور دیتے ہوئے کہا،'' پیرو مُرشد! مجھے اس بات کا قطعی ملال نہیں کہ وہ ہمارے گروہ میں کیوں شامل نہیں ہوا۔ بلکہ میں اس بات پر حیران ہوں کہ مخالف گروہ میں وہ کونسی خاصیت ہے کہ اکثر لوگ اُن کی طرز روش اپنا کر فوراً اُن کے رنگ میں رنگ جاتے ہیں اور ان کی تعداد میں۔۔۔''

میں نے دانستہ اپنی بات چھوڑ دی تھی۔

سُن کر مُرشد کے چہرے پر معنی خیز مسکراہٹ پھیل گئی۔ اُنہوں نے بڑی نرمی اور شفقت سے کہا،'' میرے عزیز، اُس گروہ کی حقیقت جاننے کے لئے تیسری آنکھ چاہئے اور یہ تیسری آنکھ کڑی ریاضت اور آزمائشوں سے گزرنے کے بعد نصیب ہوتی ہے۔ اُنہوں نے لمحہ بھر رُک کر پھر کہا،'' مخالف گروہ کی عینک بڑی طلسماتی ہے اُس عینک سے دور کی شئے قریب، سوکھی گھاس سرسبز شاداب اور اوبڑ کھابڑ راستے ہموار نظر آتے ہیں۔'' مرُشد کی بات سن کر میں سوچ میں پڑ گیا مگر، دوسرے ہی پل میرے ذہن میں بجلی سی کوندی اور ان کی بات میں جو فلسفہ تھا، اپنی پوری معنویت کے ساتھ مجھ پر عیاں ہوگیا۔

میں نے اپنی عینک اُتار کر اطراف کا جائزہ لیا پھر عینک اچھی طرح صاف کر کے لگالی۔ ہر شئے اپنی اصل حالت اور اپنے فطری رنگ میں نظر آ رہی تھی۔ میری ذہنی الجھن اور کشمکش یکسر ختم ہوگئی۔

میں نے دیکھا مُرشد اپنے معمول کے مطابق کُشادا آنگن میں لگے پودوں کو پانی دینے میں مصروف ہو گئے تھے مجھے مخالف گروہ کی اکثریت پر تاسف اور اپنے گروہ کی اقلیت پر فخر ہو رہا تھا۔!! ☆☆

www.urduchannel.in

سراب زدہ

وہ ضلع پریشد کے محکمۂ تعلیم میں بحیثیت مدرس خدمات انجام دے رہا تھا۔اسے اپنے پیشے سے بے حد لگاؤ تھا۔وہ اکثر اپنے فرائض کی ادائیگی اور تعلیمی سرگرمیوں میں مصروف رہا کرتا، اسی لیے گاؤں سے دور ہونے کے باوجود اسے نہ کبھی دوری کا احساس ہوا، اور نہ کبھی ٹرانسفر کی ضرورت محسوس ہوئی تھی۔لیکن باپ کی اچانک موت سے گھر کی تمام ذمہ داریاں اس کے سر آ گئی تھیں۔چھوٹے بھائی بہنوں کی نگہداشت اور پرورش، بہن کی شادی اور بیمار ماں کا علاج۔وطن سے دور رہ کر ان ذمہ داریوں کو پورا کرنا ممکن نہ تھا۔چنانچہ اسے اپنے گاؤں رہنا بے حد ضروری ہو گیا تھا۔

اس نے ٹرانسفر کے لیے کئی عرضیاں بھیجیں، افسران سے ملاقاتیں کیں، ہیڈ آفس کے چکّر کاٹتے اس کی جوتیاں گھِس گئیں مگر ٹرنسفر نہ ہو سکا۔بہر حال ناکامی کی صورت میں اسے یہ تجربہ ضرور ہوا کہ سرکاری ملازمین کے ٹرانسفر کی باگ ڈور دراصل سیاسی عہدہ داروں کے ہاتھوں میں ہوتی ہے اور وہ سرکاری ملازموں کو کٹھ پتلیوں کی طرح اِدھر سے اُدھر گھماتے رہتے ہیں۔بس کسی منتری کی سفارش یا ضلع پریشد کے کسی اہم رکن کی حمایت حاصل ہو تو قانونی پابندیوں کے باوجود سب کچھ ہو سکتا ہے۔مگر وہ تو ایک ایسے

پسماندہ طبقے سے تعلق رکھتا تھا، جس کی سات پشتوں سے جہالت جونک کی طرح چمٹی ہوئی تھی۔اس لیے کسی سیاسی رہنما تک رسائی تو کیا، اس کی پہچان تک نہ تھی۔اس نے سنجیدگی سے اپنے درپیش مسائل کا کوئی دوسرا حل تلاش کیا مگر اپنے آپ کو نامساعد حالات کے جنگل میں اس طرح گھرا ہوا پایا کہ ٹرانسفر کے سوا کوئی راستہ دکھائی نہ دیا۔

تمام کوششوں کے بعد وہ مایوس ہو چکا تھا، مگر چند مہینوں بعد ضلع پریشد الیکشن ہوئے اور اس بار جو ضلع پریشد صدر منتخب ہوا، وہ حسن اتفاق سے ابتدائی تعلیم کے دوران اس کا ہم جماعت رہ چکا تھا۔اسے ناامیدی کے اندھیرے میں امید کی ایک کرن دکھائی دی۔وہ ٹرانسفر کے لیے دوبارہ کوشش کرنے لگا۔آفس کے کئی چکر لگانے کے بعد بڑی مشکل سے وہ صدر صاحب کے حضور پہنچ پایا ۔اس نے اپنے گاؤں اور اسکول کے زمانے کی پہچان بتا کر بڑی اپنائیت سے اپنی دکھ بھری داستان سنائی۔صدر صاحب نے اسے تسلی دی اور متعلقہ آفیسر کے کلرک کو بلوا کر ضروری معلومات درج کرواتے ہوئے کہا، ''دیکھو، یہ ہمارے بچپن کے ساتھی ہیں۔ان کا ٹرانسفر جلد ہو جانا چاہیے۔'' ''یس، سر۔!'' کلرک نے بڑی گرمجوشی سے جواب دیا۔صدر کو اس قدر ہمدرد پا کر شدتِ جذبات سے اس کی آنکھیں نم ہو گئیں اور دوسرے ہی لمحے چہرے پر خوشی کی لہریں ابھر آئیں۔وہ صدر کو دست بستہ نمستے کر کے چیمبر سے باہر نکل گیا۔آج اس کی آنکھوں میں گہری چمک تھی اور اسے دیکھ کر ایسا لگ رہا تھا جیسے صحرا کی طویل مسافت میں کافی تلاش کے بعد اسے نخلستان نظر آ گیا ہو۔

چند روز تک وہ ٹرانسفر کے بعد کی سرگرمیوں کے متعلق سوچتا رہا۔پھر وہ ہر نئے دن ٹرانسفر آرڈر کا انتظار کرنے لگا۔ایک ہفتہ، دو ہفتے ایک مہینہ مسلسل انتظار نے اسے ایک بار پھر گہری سوچ میں ڈبو دیا۔بہت دیر تک وہ امید و بیم کی کشمکش مین مبتلا رہا۔اچانک اس کے ذہن میں ایک خیال بجلی کی طرح

www.urduchannel.in

کوندا،ممکن ہے کلرک نے رشوت کی لالچ میں اس کا کام آگے نہ بڑھایا ہو۔کیونکہ وہ کلرکوں کی رشوت خوری کے کافی چرچے سن چکا تھااوراس خیال کے تنکے نے اس کے ڈوبتے دل کوسہارلیا۔

دوسرے روز وہ آفس پہنچا۔کلرک اسے کہیں دکھائی نہ دیا۔اس نے چپراسی سے دریافت کیاتو معلوم ہوا کہ متعلقہ کلرک ایک ہفتے کی چھٹی پر ہے۔وہ مایوس ہوکر گھرلوٹ آیا۔ایک ہفتہ بڑی بیقراری اور بے چینی میں گزرا۔دوسرے ہفتے بڑی تگ ودو کے بعدکلرک سے اس کی ملاقات ہوئی،وہ بڑی عاجزی سے مخاطب ہوا،''نمستے بھاؤصاحب، کلرک نے جواب دیے بغیر اسے مضحکہ خیز نظروں سے دیکھتے ہوئے پوچھا،''کیا بات ہے!؟'' دیکھیے سر،میں انتہائی پریشان کن حالات سے دوچار ہوں،پچھلے دنوں صدر صاحب نے ٹرانسفر کے لیے میرا نام لکھوایا تھا۔وہ کام ابھی تک نہیں ہوا، پلیز میرا آرڈر۔۔۔''

''آپ کا کام نہیں ہوگا۔'' کلرک نے اس کا جملہ کاٹتے ہوئے ٹکا سا جواب دیا۔''اس کام کے لیے میں آپ کونذرانہ دینے کے لیے تیار ہوں۔''اس نے برجستہ مگر ڈرتے ڈرتے کہا۔'' کلرک کے چہرے پر طنزیہ مسکراہٹ ابھر آئی۔''کوئی فائدہ نہیں،میں بھی آپ ہی کی طرح ایک کرمچاری ہوں میں آپ کا ٹرانسفرنہیں کرسکتا۔بات اس کی سمجھ میں نہیں آئی۔اس نے جھنجلا کر کہا،صدر صاحب کا حکم ہونے کے باوجودآپ میرا آرڈر کیوں نہیں۔۔۔!؟کلرک نے لمحہ بھر اسے گہری نظروں سے دیکھا،مگراس کی آنکھوں سے لاچاری اور بےبسی چھلکتی دیکھ کراسے بجائے غصے کے اس پر رحم آ گیا۔اس نے ذرا قریب ہوکر اسے سمجھایا:''آپ بےکار آس لگائے بیٹھے ہیں۔صدر صاحب نے جوآپ کا نام لکھایا تھا،اس طرح ہمارے پاس روزانہ کئی نام لکھوائے جاتے ہیں۔وہ سب نام،کام کرانے کے لیےنہیں بلکہ محض آپ جیسےلوگوں کو تسلّی دے کرٹالنے کے لیے ہوتے ہیں۔کلرک کی بات سن کراس کے پاؤں تلے سے زمین نکل گئی اوروہ سکتے کے عالم میں دورجاتے ہوئےکلرک کوویران نظروں سے دیکھتارہ گیا۔!! ☆☆

خارزار کا مسافر

اس نے جب ہوش سنبھالا تو ضرورتیں اس کے قدموں سے لپٹی ہوئی تھیں اورحقوق وفرائض دامن گیر تھے،جن کی تکمیل ہی سفرِ حیات تھا۔اس کے پیش رو یہ سفر طئے کر چکے تھے۔بحر و بر کا سفر،جنگل بیابان اورریگستانوں کا سفر۔جہاں سکھ کی کلیاں اوردکھ کے کانٹے بچھے ہوئے تھے۔جن پر چل کر کبھی اس کے قدموں سے جھرنے پھوٹ پڑے تھے،دہکتی آگ گلزار بن گئی تھی اورمصائب کے اونچے اونچے پہاڑ ایمان کی گرمی سے موم کی طرح پگھل گئے تھے۔گویا یہ سفر،سفر نہ ہو بلکہ ایک آزمائش ایک امتحان ہو۔

یہ سفراس کے لیے مشکل ضرورتھا لیکن ناممکن نہیں،کیوں کہ اس کی جھولی میں علم وحکمت کا انمول خزانہ اوراپنے اسلاف کے تجربات کا سرمایہ تھا جوزندگی کی انجان تاریک راہوں میں مینارۂ نور کی طرح اس کی رہنمائی کرسکتا تھا مگر چندقدم چلنے کے بعد ہی اسے یہ راستہ کافی دشواراور پیچیدہ لگا۔اندیشوں کے گہرے سایوں نے اسے آگھیرا اوراس کے کمزورقدم لڑکھڑا گئے۔اپنے اطراف کے ماحول کا جائزہ لینے کے لیے وہ رک گیا۔اس نے دیکھا کہ کچھ لوگ بڑی عالی شان پُرلطف عیش ونشاط کی زندگی جی رہے ہیں۔

www.urduchannel.in

اس کے قدم غیر ارادی طور پر ان لوگوں کی طرف اٹھ گئے۔ جب وہ ان کے قریب پہنچا تو ان کے زرق برق معطر لباسوں، رنگا رنگ روشنیوں میں نہاتی فلک بوس عمارتوں اور دل فریب رقص و سرود کی محفلوں نے اسے مسحور کر دیا۔ اس کی آنکھوں سے رشک و حسد جھلکنے لگا اور بلا تامل اس نے ان لوگوں کی تقلید کو اپنا شعار بنالیا۔

اب اس کے سامنے ایک سبز مخملی رہگزر تھی جس پر رنگا رنگ تتلیاں آنکھ مچولی کھیل رہی تھیں۔ وہ آنکھوں میں خواب سجائے ماہ و سال کی گردشوں سے بے خبر دوڑتا رہا۔ ہر خواب کی تکمیل ایک نئے خواب کو جنم دیتی رہی۔ اور وہ دلکش رنگین تتلیوں کے تعاقب میں آگے بڑھتا رہا۔ اس کی سماعت کے دریچوں پر ہوس کے تالے پڑ چکے تھے۔ اور وہ ایک مشینی انسان بن کر رہ گیا تھا۔ وقت گزرتا رہا اور وہ زمین سے آسمان تک فضاؤں، خلاؤں میں اڑتا چاند تاروں پر کمندیں ڈالتا رہا اور اپنی جھولی بھرتا رہا۔

ایک طویل مدت بعد، جب اس کے بالوں میں چاندی پھیل گئی، عمر کے بوجھ سے کمر کمان ہونے لگی، کتابوں کے الفاظ رینگتے دکھائی دینے لگے۔ تھکے پیروں نے آگے بڑھنے سے انکار کر دیا۔ اس نے آرام و استراحت کے لیے اپنا سارا بوجھ اور آنکھوں پر چڑھی عینک اتار دی۔ تب اس کے وجود میں احساس کی لہریں دوڑ گئیں اور اسے یوں لگا۔ جیسے وہ کوئی طویل طلسمی خواب سے بیدار ہوا ہو۔ اور جب احساس کے سبھی دریچے کھل گئے تو اس نے اپنے آپ کو گھنے جنگل میں ایک ببول کے درخت کی شاخوں پر بنے مچان پر پایا۔ جس کی دوسری شاخوں پر چیل، کوؤں، گرگٹ، خنزیر اور سانپوں کی شکل کے انسانوں کا بسیرا تھا۔ ان کے چہروں سے عیاری درندگی اور حیوانیت ٹپک رہی تھیں۔ وہ حیران و پریشان ہوا تھا۔ اور جب اس کی نظر ببول کے تنے سے لپٹے ہوئے خوف ناک اژدہے پر پڑی تو وہ لرز کر رہ گیا۔ اس نے اطراف کا جائزہ لیا۔

نیچے تاحدِ نظر بنجر زمین خاردار پودوں سے اٹی ہوئی تھی کچھ فاصلے پر ایک طرف آتشی دلدل ابل رہی تھی اور دوسری طرف ایک چٹان پر گدھوں کا پرا بیٹھا ہوا تھا۔ ان انسان نما جانوروں کے درمیان اس کا دم گھٹنے لگا، اور جب اژدہا اس کی طرف بڑھنے لگا تو گھبرا کر اس نے نیچے چھلانگ لگا دی۔ بھالے کی اَنی کی طرح تیز انگنت کانٹے اس کے جسم میں پیوست ہو گئے کانٹوں بھری ٹہنیوں میں الجھ کر اس کا پیرہن تار تار ہو چکا تھا اور بدن پر جا بجا گہری خراشیں آ چکی تھیں۔ رستے زخموں کی جلن اور چبھن سے وہ کراہنے لگا۔ اور پھر کچھ دیر بعد جب دوپہر کا آگ اگلتا سورج اس کے وجود پر نیزے برسانے لگا۔ اس کی آنکھیں چندھیانے لگیں، پیٹ دھسنے لگا اور زبان تالو چاٹنے لگی۔ اس نے اپنی بکھری ہوئی ہمت بٹور کر کھڑے ہونے کی کوشش کی مگر اس کے بوڑھے زخمی لرزتے پیر اس کا ساتھ نہ دے سکے۔ اور وہ بڑی بے بسی سے ببول کی ننگی ٹہنیوں کی طرف حیرت سے دیکھنے لگا۔ جو اسے نہ سایہ دے سکتی تھیں نہ پھل۔!!

www.urduchannel.in

آوارہ کتّے

کتّے وفادار ہوتے ہیں لیکن آوارہ کتے ہر کس و ناکس کو بھونکنے اور کاٹنے دوڑتے ہیں یا کبھی اسقدر اودھم مچاتے ہیں کہ لوگوں کی نیندیں حرام ہوجاتی ہیں دوسرے شہروں کی بہ نسبت اُس مہانگر میں آوارہ کتّوں کی بڑی کثرت تھی۔ان کی بربریت سے پورے شہر میں دہشت پھیلی ہوئی تھی۔نگر نگم والے ان آوارہ کتوں کو لاریوں میں بھر کر شہر سے دور گھاٹی میں چھوڑ آتے مگر چند ہی دنوں بعد وہ پھر اپنی مخصوص تعداد میں دکھائی دیتے۔اس امر پر نہ صرف نگر نگم کے کرمچاری بلکہ شہری بھی حیران تھے۔

شہر کے امیر و کبیر لوگوں نے ان آوارہ کتّوں کی مدافعت اور اپنے مال و متاع کی حفاظت کے لئے اعلیٰ نسل کے ولایتی کتے پال رکھے تھے، جو آٹھوں پہر ان کے عالیشان بنگلوں پر تعینات ہوتے۔ کمپاؤنڈ گیٹ پر لگی کلوز اپ تصویر کے نیچے خطرے کا نشان بنا ہوتا یاؔ کتے سے ہوشیارؔ کتے سے دور رہیں۔!'' کی ہدایت لکھی ہوتی۔ یہ کتے واقعی اپنے مالک کے بڑے وفادار اور فرمانبردار ثابت ہوتے۔

فلیٹ کے قریب آوارہ کتّوں کی آمد تو درکنار ان کا ادھر سے گزر بھی محال ہوتا۔ پالتو کتوں سے نظر ملتے ہی وہ دم دبا کر اپنی راہ نکل جاتے۔اور پھر سرِ راہ آوارہ کتّوں سے امیر لوگوں کا کیا واسطہ وہ تو ہمیشہ فور وہیلر پر سوار رہتے ہیں ہیں۔سابقہ پڑتا ہے تو ان انسانوں کا جو حشرات الارض کی طرح زمین پر چلتے ہیں۔

میں جس کالونی میں رہتا تھا اس علاقے میں بھی آوارہ کتّوں کا مسکن تھا۔ وہ آتے جاتے راہ گیروں پر غراتے، بھونکتے اور اجنبی کا پیچھا کر کے اسے گھیر لیتے۔کبھی کبھی کاٹنے کی واردات بھی ہوجاتی۔ میں بھی وہاں نووارد تھا۔ دفتر سے چوک تک آنے جانے میں مجھے کوئی دقت نہ ہوتی مگر چوک کے نکڑ سے مکان تک کا پیدل سفر بڑا اذیت ناک ثابت ہوتا۔ وہ آوارہ کتّے مجھے بھی ہمیشہ گھورتے، غراتے اور کبھی تو ان کے تیور دیکھ کر ایسا لگتا کہ بس اب وہ میرے تعاقب کے درپے ہیں۔ مجھے پسینے چھوٹ جاتے، کبھی رونگٹے کھڑے ہوجاتے اور مجھ پر اختلاجی دورہ پڑنے لگتا۔ میں بدحواسی کے عالم میں گھر پہنچتا۔ میری حالت دیکھ کر اکثر بیوی پوچھتی: ''آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے، بڑے گھبرائے ہوئے لگ رہے ہیں۔'' اور میں اپنے آپ کو سنبھال کر کوئی بات بنا دیتا۔

ایک روز مجھے تیز تیز قدموں سے آتے دیکھ کر میرے پڑوسی کیلاش بابو نے کہا: ''کیوں بھائی ملک ایسا لگ رہا ہے آپ دفتر سے گھر نہیں۔گھر سے دفتر جا رہے ہیں۔!'' کیا مطلب!؟ میں نے حیرانی سے پوچھا۔ میرا مطلب ہے، واپسی سکون سے ہونی چاہیے، البتہ دفتر جاتے وقت عجلت ضرور ہوسکتی ہے۔!'' جی، نہیں، وہ۔۔۔، میں گڑبڑا گیا اور خاطر خواہ جواب نہیں دے سکا۔ کیلاش بابو میری حالت دیکھ کر سمجھ گئے تھے کہ میں آوارہ کتّوں کی اذیت جھیل رہا ہوں۔ شاید یہ ان کا ذاتی تجربہ ہو جو انہوں نے میری کیفیت کو بھانپ لیا تھا۔

آئے دن شہر میں ان آوارہ کتّوں کی بربریت کے واقعات ہوتے رہتے۔ کبھی کسی معصوم بچی

www.urduchannel.in

کے شکار ہونے کی خبر، کبھی کسی اجنبی شخص پر حملے کی خبر یا کبھی آوارہ کتّوں کو شہر سے باہر کر دیے جانے کی خبر۔ اف، یہ آوارہ کتّوں کا وبال کہ اکیسویں صدی کا ترقی یافتہ انسان کیسی غیر محفوظ اور خوف و ہراس کی زندگی جی رہا ہے۔ یہ سوچ کر دل بے چین اور طبیعت پریشان ہو جاتی۔

شام کا وقت تھا۔ میں اپنے مکان کی ٹیرس پر کھلی ہوا میں چہل قدمی کر رہا تھا۔ اتفاقاً کیلاش بابو بھی اپنے ٹیرس پر آ گئے، جو میرے مکان سے لگ کر رہتے تھے۔ نظر ملتے ہی میں نے انہیں مسکراتے ہوئے نمستے کیا۔ انہوں نے بھی خندہ پیشانی سے جواب دیا۔ اور میرے قریب آ گئے۔ ہم دونوں کے درمیان صرف تین فٹ اونچی پیراپیٹ وال تھی۔ میں نے دریافت کیا: ''کیلاش بابو آپ اس کالونی میں کب سے رہ رہے ہیں۔!؟'' ''مجھے یہاں تقریباً دس سال ہو چکے ہیں، کیوں کیا بات ہے۔!؟'' انہوں نے قدرے حیرانی سے پوچھا۔ ''جی میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ کیا آپ کو ان آوارہ کتّوں سے کوئی تکلیف نہیں۔!؟'' ''فی الحال تو بالکل نہیں۔ ہاں ابتداء میں پریشان تھا، جیسے اس وقت آپ ہیں۔!' میں نے کھل کر کہا: ''کیلاش بابو، واقعی یہ آوارہ کتّے بڑے خطرناک ہیں۔ انہیں دیکھ کر خوف طاری ہو جاتا ہے۔ کہیں کسی روز حملہ کر دیا تو۔۔۔!!''

وہ میرا اظہار مدّعا سمجھ گئے۔ بڑی اپنائیت سے بولے: ''گھبرائیے نہیں ملِک میں ایک ترکیب بتاتا ہوں۔ آپ کا ٹینشن ختم ہو جائے گا۔!'' میری آنکھیں چمک اٹھیں۔ ''بڑی مہربانی ہوگی آپ کی، بتا دیجئے۔!'' دیکھئے ملِک بھائی آپ ان آوارہ کتّوں کو ایک بار Pork (سوّر کا گوشت) کھلا دیجئے۔ بس پھر وہ آپ سے مانوس ہو جائیں گے۔!'' تُف، لاحول ولاقوۃ میں نے دل ہی دل میں کہا۔ میرے تاثرات دیکھ کر کیلاش بابو نے کہا: ''کیوں، کیا ہوا۔!!'' میں نے کہا: ''کوئی دوسرا طریقہ بتائیے!'' انہوں نے بے تکلفی سے جواب دیا: ''وہ آپ سوچئے۔!'' میں کیلاش بابو کا منہ دیکھتا رہ گیا۔ پھر قدرے

توقف کے کڑواہٹ مٹانے کے لئے سنجیدگی سے پوچھا: ''بابو جی، یہ سوّر کے گوشت کی ترکیب آپ کو کس نے بتائی تھی۔!؟''

'' واہ ملِک بھائی آپ نے یہ بڑا دلچسپ سوال پوچھا ہے۔ آپ کو یہ جان کر حیرت ہوگی کہ اس مہانگر کے معروف سابق میئر مسٹر کے۔ کے۔ پہلے اسی کالونی میں رہتے تھے۔ انہوں نے یہیں سے اپنا ٹوسٹ بریڈ کا کاروبار ہاتھ گاڑی پر شروع کیا تھا۔ انہیں اکثر ان آوارہ کتّوں سے سابقہ پڑتا تھا۔ وہ بڑے گھاگ آدمی تھے۔ انہوں نے ہاتھ گاڑی سے بیکری، بیکری سے ہوٹل اور ہوٹل سے فائیو اسٹار ہوٹل تک اپنا کاروبار بڑھایا تھا، آج وہ شہر کے نامور لیڈر ہیں۔ ان کے بنگلے پر اعلیٰ نسل کے کتوں کی پہرداری ہے اور لینڈ کروزر کار میں جرمن شیفرڈ کی سیکوریٹی ہوتی ہے۔ مجھے یہ ترکیب انہی مہاشے نے بتائی تھی۔ اب فیصلہ آپ کیجئے۔ اور وہ چلے گئے۔

کیلاش بابو کے جانے کے بعد ان کی باتیں میرے ذہن میں گھومتی رہیں لیکن لاحاصل کہ ان کے بتائے ہوئے طریقے پر عمل کرنا میرے لئے ممکن نہ تھا۔ مجھے کتّوں کی نفسیات کا علم تھا نہ ہی کوئی تجربہ۔ پھر بھی میں سوچنے لگا۔ کچھ دیر کئی بے تکے خیالات گڈمڈ کرتے رہے۔ اسی کشمکش کے دوران اچانک ذہن میں بجلی سی کوندی اور میرا ضمیر جھنجلا اٹھا: ''کتّوں سے مصالحت، تُف۔ ایسی زندگی سے تو موت بہتر ہے۔ کیلاش بابو ہو یا مسٹر کے۔ کے۔ کسی کی راہ پر نہیں چلنا، ''جیو تو ان جانبازوں کی طرح جن کے کارناموں سے تاریخ روشن ہے۔'' اس خیال نے مجھ میں روحانی قوت پیدا کر دی اور میں نے عزم کر لیا کہ ان آوارہ کتّوں سے صلح نہیں، جنگ کرنی ہے۔ صرف جنگ۔ کہ زندگی جنگ جیتنے کا نام ہے۔!!!

www.urduchannel.in

دُکھی آتما

آتماؤں کو اتوار کا دن اپنی مرضی سے گزارنے کی آزادی تھی۔اس روز سبھی آتمائیں پرلوک سے دھرتی پر اتر آیا کرتی تھیں۔آوارہ ،لاوارث آتمائیں گھومنے پھرنے اور موج مستی میں دن گذار دیتیں لیکن، چونکہ آتما کی ڈور رشتوں میں بندھی ہوتی ہے،اکثر آتمائیں اپنے شہر اپنے گاؤں جا کر اپنے پریوار اور پیچھے چھوٹے ہوئے کاروبار کا جائزہ لیا کرتیں۔ان میں کوئی آتما خوش اور کوئی دکھی ہو کر لوٹتی۔ آتماؤں کے بیچ ایک مہا آتما بھی تھی۔مہا آتما ایک بڑے سنت کی آتما تھی۔اس کا دنیا میں کوئی نہیں تھا،اور نہ ہی اسے دنیا سے کچھ لگاؤ تھا۔مہا آتما کا سارا جیون بستی سے دور پہاڑ کی چوٹی پر گھور تپسیا میں گزرا تھا اور اب وہ آتماؤں کا دکھ درد بانٹنے اور انھیں سکھ پہنچانے کا کار یہ کر رہی تھی۔ان خوبیوں کے سبب پرماتما کے دل میں مہا آتما کی بڑی قدر و منزلت تھی۔

ایک اتوار کو جب آتمائیں دھرتی سے پرلوک واپس آئیں،مہا آتما اپنے معمول کے مطابق

ان کا احوال پوچھنے نکل پڑی،سب سے پہلے اسکی ملاقات ایک راج نیتا کی آتما سے ہوئی۔مہا آتما نے اسکی خیر خواہی کی۔نیتا کی آتما نے کہا،''سب کُشل منگل ہے۔میرا بیٹا اُدّیوگ پتی ہے۔کارخانے،فائیو اسٹار ہوٹلیں اور پرائیوٹ ایئر لائنس کروڑوں کا انٹرنیشنل کاروبار ہے اس کا۔میرا پریوار راجے مہاراجے سی زندگی جی رہا ہے۔وہ سب پرتی دن میرے فوٹو پر مالا چڑھا کر ہی اپنا کام شروع کرتے ہیں۔میں بڑا بھاگیہ وان ہوں۔پھر نیتا کی آتما نے مہا آتما سے پوچھا،''سب آتمائیں دھرتی پر آتی جاتی ہیں،مگر آپ کبھی دکھائی نہیں دیں،کیا آپ کو پرماتما کی انومتی نہیں ہے؟نہیں نہیں،ایسی کوئی بات نہیں ہے،مجھے پرلوک میں ہی رہنا پسند ہے۔''مہا آتما نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

اس کے بعد مہا آتما آگے بڑھی تو سامنے سے آتی ہوئی ایک اجنبی آتما نے اسے سیلوٹ کے انداز میں سلام کیا۔مہا آتما،آتما کا باوقار چہرہ اور بلند قد و قامت دیکھ کر رک گئی اور بڑی اپنائیت سے بولی،''شاید تم ابھی ابھی پرلوک آئی ہو۔''جی،مجھے آج ہی لایا گیا ہے۔''تم تو جوان اور بلوان ہو،تمہاری مرتیو کیسے ہوئی اور تمہارے بازو پر کُندے ہوئے اس ترنگے کا مطلب کیا ہے۔؟''اجنبی آتما نے سینہ پھلا کر جواب دیا،''میں ایک فوجی جوان تھا۔اپنے ماں باپ کا اکلوتا بیٹا،انھوں نے مجھے دیش بھکتی کا پاٹھ پڑھایا تھا۔بھگت سنگھ،اشفاق اللہ خان،رام پرشاد بسمل اور ٹیپو سلطان کے بلید ان کی کہانیاں سنائی تھیں۔ان کی اِچّھا تھی کہ ان شہیدوں کی طرح میں بھی اپنا تن،من،سب کچھ اپنے دیش پر نچھاور کردوں۔انھوں نے فوجی بنا کر مجھے دیش کو سمرپت کر دیا تھا۔آج صبح راجدھانی پر دہشت گردانہ حملہ ہوا تھا۔دہشت گرد ایک فائیو اسٹار ہوٹل کے 3rd Floor پر چھپے ہوئے تھے۔فوجی آپریشن جاری تھا،لیکن دہشت گرد ہتھیار ڈالنے تیار نہ تھے۔وہ بڑی بے دردی سے بندھکوں کو مار کر باہر پھینک رہے تھے۔سر سے کفن باندھ کر ہم چند ساتھی بڑے جوکھم بھرے راستے سے ہوٹل میں داخل ہوئے اور ان

www.urduchannel.in

دہشت گردوں پر گولیوں کی بوچھار کردی۔اس مڈبھیڑ میں دہشت گرد مارے گئے اور میں اپنے دیش کے کام آ گیا۔ میرے ماتا پتا کو مجھ پہ گرو ہے۔میں دیکھ رہا ہوں،اس وقت ان کی آنکھوں سے ہیرے موتی ٹپک رہے ہیں۔انمول ہیرے موتی جو سچّے دیش بھکت اپنے دیش پر لٹاتے ہیں۔'' فوجی کی سرگزشت سن کر مہا آتما نے فرطِ مسرت سے آگے بڑھ کر اسے گلے لگا لیا اور کہا،''تم بڑے بھاگیہ شالی ہو،تمہارا جیون سپھل ہو گیا میں تمہاری ویرگتی کو پرنام کرتا ہوں۔

اپنے مسکن پر لوٹتے وقت مہا آتما کو کچھ دوری پر سب سے الگ پیڑ کے نیچے ایک آتما دکھائی دی۔مہا آتما تیز قدموں سے وہاں پہنچی اور اس سے دریافت کیا؛''کیا بات ہے؟ تم بہت اداس لگ رہی ہو۔!'' دکھی آتما نے رندھی آواز میں جواب دیا؛''کیا بتاؤں میں بڑی ابھاگن ہوں،مرنے سے پہلے بھی پریشان تھی اور مرنے کے بعد بھی بے چین ہوں۔'' ''تم کس سنکٹ میں ہو۔؟'' مہا آتما نے نرمی سے پوچھا۔دکھی آتما نے بھیگی آواز میں جواب دیا،''میری پتنی ایک مدت سے بیمار ہے، بیٹی کی شادی اور بیٹے کی نوکری میری اچانک موت سے سارے کام ادھورے رہ گئے۔میرا پریوار بڑی مصیبت میں ہے۔!'' بولتے ہوئے اسکی آنکھوں سے آنسو نکل پڑے۔مہا آتما نے اسکے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا،''تم چنتا مت کرو۔سب ٹھیک ہو جائے گا، میں تمہارے لیے پرماتما سے پراتھنا کرونگی۔!''

دکھی آتما کی بپتا سن کر مہا آتما بے چین ہو گئی تھی۔اس نے بھکتی ارچنا کی اور ہاتھ جوڑ کر پرماتما سے پرارتھنا کی۔ہے بھگوان ! اس دکھی آتما پر دیا کرو،وہ بڑے سنکٹ میں ہے۔اسکے پُتر کو نوکری لگا دو،کرپا کرو بھگوان۔'' ''ٹھیک ہے مہا آتما،ہم تمہاری بنتی ضرور سنیں گے۔ پر،تم یہ بھول رہی ہو کہ جو آتما سنکٹ میں ہے،اسے چاہیے کہ اپنے لیے وہ خود بھی پرارتھنا کرے،ہمیں بھکت کی بھکتی ہی پرسنّ کرتی ہے۔!'' پرماتما کا جواب سن کر مہا آتما سر جھکا کر چپ ہو گئی۔

چند روز انتظار کے بعد دکھی آتما نے مہا آتما سے پوچھا:''سوامی،کیا تم نے میرے لیے پرماتما سے پرارتھنا نہیں کی۔!؟'' مہا آتما نے قدرے توقف کے گمبھیر لہجے میں جواب دیا:''دیکھو بھائی کشٹ تمہیں ہے،مصیبت میں تم ہو،تم کو بھی پرارتھنا کرنی چاہیے۔ پرماتما سب کی سنتے ہیں۔وہ بڑے دیالو،کرپالو ہیں۔کبھی کسی کے ساتھ اَن نیائے نہیں کرتے۔'' مہا آتما کا اپدیش سن کر دکھی آتما کو اپنی کوتاہی اور غلطی کا شدید احساس ہوا اور اس نے دل میں ارادہ کیا کہ اب وہ روزانہ بھگوان سے پرارتھنا کرے گی۔شام کو دکھی آتما ایکانت میں بیٹھ کر بڑی دیر تک پرماتما کی اپاسنا کرتی رہی اور پھر اس نے ہاتھ جوڑ کر التجا کی:'ہے بھگوان، میں بڑی دُشٹ آتما ہوں،آپ کی دوشی ہوں،مگر آپ ہی کی داسی ہوں۔آپ مہان ہیں، دیالو،کرپالو ہیں۔کشٹ نوارک ہیں۔مجھے شما کر دیجیے۔میرا پریوار بڑے سنکٹ میں ہے،آپ ہی انھیں سنکٹ سے نکال سکتے ہیں۔میرے بیٹے کو نوکری پر لگا دیجیے بھگوان۔دیا کریں مجھ ابھاگن پر، دیا کریں بھگوان۔'' وہ ہاتھ جوڑے سر نیواڑے دیر تک پرارتھنا کرتی رہی۔ پرارتھنا کرنے سے دکھی آتما کو بڑی راحت ملی اور اس کے مایوس دل امید کی سنہری کرن اتر آئی۔

مہا آتما کی ارچنا اور دکھی آتما کی پرارتھنا رنگ لائی۔ایک ہفتہ بعد مہا آتما نے دکھی آتما کو خوش خبری سنائی کہ پرماتما نے تمہاری منوکامنا پوری کر دی،تمہارے بیٹے کو نوکری مل گئی ہے۔دکھی آتما خوشی سے جھوم اٹھی۔اس نے فوراً مہا آتما کے چرن چُھو کر عقیدت کا اظہار کیا اور ماتھا ٹیک کر پرماتما کی شکر گزاری کی۔اس کی آنکھوں میں رنگا رنگ تارے جھلملانے لگے، دل میں بسی دیرینہ خواہشیں رقص کرنے لگیں اور تصورات کے رتھ نے اسے دھرتی پر پہنچا دیا:''اس کا مکان چھل مل برقی قمقموں سے روشن ہے، باورچی خانہ سے لذیذ پکوانوں کی خوشبو آ رہی ہے، بیوی کی آنکھوں سے گہری مسرّت چھلک رہی ہے، بیٹا آفس جانے کی تیاری کر رہا ہے اور آنگن میں کھڑی نئی بائک اس کی منتظر ہے۔''

www.urduchannel.in

اب، دکھی آتما کو اتوار کا انتظار تھا، اتوار جو، اسکے خوابوں کی تعبیر، اسکی اداسی اور پریشانی کا مداوا تھا۔ وہ بہت بے چین و بے قرار تھی کہ سمئے بڑی دھیمی گتی سے چل رہا تھا۔ ایک ایک پل اسے ایک ایک دن کے برابر لگ رہا تھا۔ بالآخر، جب اتوار کا دن آیا تو دکھی آتما کو جیسے پَر لگ گئے۔ وہ بڑی بے تابی سے دھرتی پر آئی اور سیدھا اپنے محلّے میں داخل ہوئی۔ اپنے گھر کے پاس چہل پہل اور خوشی کا ماحول دیکھ کر اسکی آنکھیں چمک اٹھیں اور رفتار تیز ہوگئی مگر جب وہ قریب پہنچی تو یہ جان کر حیران رہ گئی کہ جشن پڑوسی کے گھر ہے اور نوکری پڑوسی کے بیٹے کو ملی ہے۔ اس کے ہاتھ پاؤں پھول گئے اور وہ نڈھال ہو کر وہیں بیٹھ گئی۔ ''مہا آتما کی بات غلط کیسے ہوگئی!؟ مہا آتما کی بانی تو پرماتما کا سندیش تھا۔ یہ گڑبڑ کیسے ہوگئی۔ وہ سوچ میں ڈوب گئی اور دیر تک سوچتی رہی۔ اچانک ایک بجلی سی کوندی اور اس کے ذہن میں اپنی جوانی کے زمانے کا ایک سیاہ منظر ابھر آیا۔ اور پھر، بارِ پشیمانی سے اس کا سر جُھک گیا اور جھکتا ہی چلا گیا۔☆☆☆

بدنام گلی

ظاہر باطن دونوں روشن ہوں تو نفس ریا سے پاک اور فکر صالح ہوتی ہے۔ اور اگر جگمگاہٹ صرف باہر ہی باہر ہو تو اندر کی سیاہی کسی صورت عیاں ہو ہی جاتی ہے۔ بعض لوگ اس حقیقت سے غافل ہوتے ہیں اور بعض اس خرابی کو اپنی ہنرمندی تصوّر کرتے ہیں۔ وہ شخص بھی انہی لوگوں میں سے تھا۔ ایک دن وہ ہمیشہ کی طرح بدنام گلی سے اپنے مکان کی طرف جا رہا تھا کہ اسکی نگاہ مستی میں اٹھکیلیاں کرتی ہوئی، طوائفوں پر ٹھہر گئی۔ اس نے نظریں بچانے کی ناکام کوشش کی اور حسب معمول داڑھی پر ہاتھ پھیرتے ہوئے اپنی رفتار تیز کر لی۔ لیکن، ان جواں سال حسیناؤں کے دعوتِ نظارہ دیتے ہوئے توبہ شکن جوبن کا عکس اسکی آنکھوں میں سما گیا تھا اور اب قدم بہ قدم اسکے ساتھ چل رہا تھا۔

اگرچہ بدنام گلی زیادہ تر آوارہ بدمعاشوں کی رہگزر تھی مگر اس گلی سے آنے جانے میں اسے کوئی عار نہ تھا۔ کیونکہ اس علاقے میں اس کا پشتینی مکان تھا، دوسری وجہ یہ تھی کہ دفتر اور بازار جانے کی یہ

www.urduchannel.in

نزدیک ترین راہ تھی نیز اس گلی سے اسکے بچپن کی کئی یادیں وابستہ تھیں۔ یہ گلی قریبی زمانے میں شرفاء کے محلّے کا ایک حصّہ تھی جہاں پردہ نشین خواتین کبھی دہلیز کے باہر دکھائی نہ پڑتی تھیں اور ادھر سے کسی اجنبی شخص کا گزرنا ممکن تھا۔ مگر بدلتے وقت کی بگڑتی قدروں نے اس گلی کو رفتہ رفتہ بازارِ حسن میں تبدیل کر دیا اور پھر اسکی یہی شناخت قائم ہوگئی۔

وہ نگر نگم آفس کا ایک ادنیٰ درجے کا ملازم تھا۔ مگر اسکی وضعداری قابل دید تھی۔ اسلامی طرز کا بے داغ سفید لباس، ترشی ہوئی سیاہ داڑھی، شانوں پر گز بھر لمبا عرفاتی رومال اور اس پر شاہانہ چال۔ بدنام گلی سے گزرتے وقت اسکے مزاج میں تمکنت اور رگ و پے میں پارسائی کا خمار بھر جاتا اور وہ شانِ بے نیازی سے اپنی داڑھی پر ہاتھ پھیرنے لگتا۔ کوئی طوائف اس سے نظر ملاتی نہ اشارہ کرنے کی جسارت کرتی۔ ہاں یہ جرأت صرف شانتا بائی میں تھی۔

شانتا بائی شہر کی ایک معروف طوائف تھی۔ تعلیم یافتہ ہونے کے سبب اس کا شعار عام طوائفوں سے مختلف تھا۔ وہ زندہ دل، بے باک اور بلا کی مردم شناس تھی۔ دھندے کے اسکے اپنے کچھ اصول بھی تھے۔ انہی صفات کی بنا پر کچھ اعلیٰ افسر اور خاص لوگ اسکے شیدائی تھے۔ شانتا بائی سے اسکا تعلق لایعنی مگر دیرینہ تھا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ موقع پا کر رک جاتا اور کسی بہانے اسکی لچھے دار باتوں اور دلکش اداؤں سے لطف اندوز ہوا کرتا۔ شانتا بائی کا دلفریب انداز اسکی طبیعت میں کیف و سرور بھر دیتا اور بے خودی میں اسکے قدم ڈگمگانے لگتے مگر وہ فوراً سنبھل کر داڑھی پر ہاتھ پھیرتے ہوئے اسکے طلسمی حصار سے باہر نکل جاتا۔ یہ اس دور کی بات ہے جب بدنام گلی میں شانتا بائی کا طوطی بولتا تھا۔ ہر مستانے کی زبان پر اسی کا نام تھا جو اس کی چاہت میں مبتلا تھا۔ مگر طوائف کا عروج تو ندی کا اُبھان ہوتا ہے۔ ذرا بدن کمھلایا اور حُسن کجلایا کہ دھندا مندا ہوا۔ اب شانتا بائی کا وہ شباب تھا اور نہ وہ چاہنے والے۔ لیکن، اس کے خون میں رچی

بسی خودداری اور خوداعتمادی، آج بھی زندہ تابندہ تھی۔

اپنی دُھن اپنے رنگ میں جب وہ گلی کے نکڑ پر پہنچا تو اتفاقاً شانتا بائی سے اسکی نظر مل گئی۔ وہ بدستور سولہ سنگھار کیے صحن میں بچھے تخت پر بیٹھی پان کا بیڑا چبا رہی تھی۔ اسے دیکھ کر اسکے چہرے پر معنی خیز مسکراہٹ ابھر آئی۔ شانتا بائی پیک تھوک کر فی الفور اس سے مخاطب ہوئی: ''کیوں میاں، کیا آج مجھ میں کوئی نئی بات دیکھ رہے ہو یا طبیعت گدگدا رہی ہے۔!'' نہیں، نہیں شانتا بائی تمہارا دیدار تو میں برسوں سے کر رہا ہوں۔ میں نے ہر رنگ ہر انداز دیکھا ہے تمہارا۔!'' اس نے رک کر برجستہ جواب دیا۔ مگر شانتا بائی اس کا چہرہ پڑھ چکی تھی۔ اس نے لہجہ بدل کر پیشہ ورانہ ضرب لگائی: ''ہاں، ہاں ضرور دیکھا ہے لیکن صرف ظاہری، اور شاید اب گھر کی ہنڈیا سے تمہارے منہ کا مزہ خراب ہوگیا ہے۔!

''نہیں نہیں، تم مجھے غلط سمجھ رہی ہو، بائی۔!''

''تو پھر، تمہاری مسکراہٹ کا مطلب۔۔۔!؟''

''ہاں، یہ بات تو ہے، دراصل آج میں نے تمہاری گلی میں چند جواں سال حسین چہرے دیکھے۔ ان کے مقابل تمہیں سجی سنوری دیکھ کر مجھے خیال آیا کہ باغ میں رنگا رنگ مہکتی، چٹکتی کلیوں کو چھوڑ کر کوئی بھونرا، میرا مطلب ہے۔۔۔!'' شانتا بائی نے اس کا جملہ کاٹتے ہوئے بڑی متانت سے جواب دیا: ''مطلب تو میں سمجھ گئی مسٹر ملِک، لیکن شاید تمہیں یہ نہیں معلوم کہ وہ خالق و مالک جو سب کا پالن ہار ہے۔ ایک کیڑے کو پتھر کے اندر بھی رزق پہنچاتا ہے۔ پھر میں تو جال بن کر بیٹھی ہوئی مکڑی کی طرح اپنے شکار کی تاک میں رہتی ہوں۔ مجھے اسکی ذات پر یقین ہے کہ اپنے نصیب کا حصّہ مجھ کو برابر ملے گا۔

شانتا بائی کا کرارا جواب سن کر وہ چکرا گیا اور ایسا چکرایا کہ داڑھی پر ہاتھ پھیرے بنا ہی نظریں چرا کر تیزی سے آگے بڑھ گیا۔ اور اب اس کے ساتھ قدم بقدم چلنے والا ابلتے جوبن کا تصوّر نہیں، خود اس کا

www.urduchannel.in

اپنا بے لباس ضمیر تھا۔!! ☆ ☆

گونگی

گرمی کا موسم تھا، ٹھنڈی ٹھنڈی سحر انگیز ہوائیں چل رہی تھیں۔ میں اپنے روم کی گیلری میں سویا نیند کے خمار سے محظوظ ہو رہا تھا کہ گونگی کی سوتیلی ماں کے ڈانٹ پھٹکار کی تیز بے ہنگم آواز نے مجھے جھنجھوڑ کر رکھ دیا اور میری نیند کا نشہ اتر گیا۔ کچھ دیر تک گونگی پر گالیوں کی یلغار ہوتی رہی اور پھر جب طوفان تھم گیا تو کچھ دیر بعد میں نے گونگی کو مکان کی بالکنی میں اپنی مخصوص جگہ پر کھڑا ہوا پایا، جہاں وہ اپنا مغموم چہرہ لئے غم کو آنسوؤں میں بہاتی رہی اور تھوڑی دیر بعد اپنے کاموں میں ایسے جٹ گئی جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو۔

گونگی رحیم چاچا کی وہ بدنصیب بیٹی تھی جو دس سال کی عمر سے سوتیلی ماں کا عذاب جھیل رہی تھی۔ پہلی بیوی کے ساتھ رحیم چاچا کے راحت بھرے دن بھی کوچ کر گئے تھے۔ بیٹی کو دیکھ کر اکثر انھیں اپنی مرحوم بیوی کی یاد آجاتی اور وہ تھوڑی دیر کے لیے اداس ہو جاتے۔ کبھی کبھی تو ان کی آنکھوں سے آنسو نکل پڑتے۔ میں جس آفس میں ملازم تھا، رحیم چاچا اس آفس کے سینئر چپراسی تھے۔ وہ بے حد مخلص اور شریف

آدمی تھے۔ دفتری کاموں کے علاوہ بابو لوگوں کے ذاتی کام میں بھی ہاتھ بٹایا کرتے تھے۔ اس لیے سبھی کارکنوں کی نظر میں ان کی عزت اور ایک مقام تھا۔ ابتدا ہی سے رحیم چاچا نے مجھے بھی اپنے بیٹے کی طرح چاہا تھا۔ انہی کے ذریعے مجھے ان کے مکان کے سامنے والا کمرہ کرائے پر ملا تھا۔

سن بلوغ کو پہنچی ہوئی گونگی بے حد حسین اور دل کش خط و خال کی مالک تھی مگر بدمزاج سوتیلی ماں کے ظلم و ستم سے وہ پنجرے کے پنچھی کی طرح پژمردہ ہو گئی تھی۔ دن بھر گھر کے کام کرنے کے باوجود اسے دو وقت کی روٹی سکون سے میسر نہ تھی۔ رحیم چاچا اکثر مجھ سے گونگی اور گھر کے پراگندہ حالات کا ذکر کے اپنے دل کا بوجھ ہلکا کر لیا کرتے تھے۔ میں انھیں دلاسہ دے کر ان کی اداسی دور کرنے کی کوشش کیا کرتا۔ ایک مرتبہ کسی تہوار کے موقع پر انھوں نے مجھے کھانے پر بلایا تھا۔ مگر جب میں وقت پر ان کے ہاں پہنچ نہ سکا تو انھوں نے ٹفن گھر پر ہی بھجوا دیا۔ اس وقت میں ٹی، وی پر کرکٹ میچ دیکھنے میں محو تھا۔ 'بابو جی!'' ایک لطیف نسوانی آواز نے مجھے چونکا دیا۔ وہ گونگی تھی جسے دیکھ کر میں حیران رہ گیا۔ میری اس کیفیت پر وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ پہلی بار میں نے اس کی آنکھوں میں چمک اور چہرے پر مسکراہٹ دیکھی تھی۔ اس کی ہنسی کمرے میں اس طرح گونج اٹھی جیسے کسی نے ستار کے خاموش تاروں کو چھیڑ دیا ہو۔ وہ ٹفن رکھ کر فوراً لوٹ گئی میں دیر تک اس کے بارے میں سوچتا رہا۔ یہ لڑکی گونگی ہے، پھر۔۔۔!!؟ میں کچھ سمجھ نہ سکا۔

دوسرے روز دفتر جاتے ہوئے میں نے رحیم چاچا سے دریافت کیا تو انہوں نے ایک سرد آہ بھر کر بتایا کہ گونگی دراصل گونگی نہیں ہے بلکہ بے رحم حالات نے اس کے ہونٹوں پر خاموشی کی مہر لگا دی ہے۔ بچپن میں جب اس سے کوئی غلطی ہو جاتی، اس کی سوتیلی ماں اسے بے تحاشہ مارا کرتی اور جب وہ اپنی صفائی میں زبان کھولتی اسے ڈانٹ کر خاموش کر دیا جاتا تھا۔ اس لئے اس نے چُپ رہنے میں ہی عافیت سمجھی اور اس کی اس مسلسل خاموشی کے سبب اسے گونگی لقب مل گیا۔ گونگی کی درد بھری کہانی سننے کے

www.urduchannel.in

بعد میری طبیعت رنجیدہ ہوگئی تھی۔ والدین کے انتقال کے بعد میں بالکل اکیلا تھا۔ نہ بھائی نہ بہن۔ رشتہ دار تو سب اپنی اپنی دنیا میں کھوئے ہوئے تھے۔ اکیلے پن کا درد میرے دل میں بسا ہوا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ دوسروں کے دکھ درد بھی میرے دل میں اتر جاتے تھے۔ میں تنہائی میں اکثر گونگی کے متعلق سوچنے لگا۔ رفتہ رفتہ میری ہمدردی کا جذبہ اس کی چاہت میں بدلتا چلا گیا اور آخر، میں اس نتیجہ پر پہنچا کہ گونگی کو شریک حیات بنا کر اس کرب ناک ماحول سے باہر نکال لوں گا۔ اپنا گھر بس جائے گا اور بے چارے رحیم چاچا کی فکر بھی جاتی رہے گی۔ اور پھر ایک روز موقع پا کر میں نے بلا تکلف رحیم چاچا سے اپنا مدعا بیان کر دیا۔

میری بات سن کر ان کی بوڑھی آنکھیں بھر آئیں اور فرط مسرت سے انہوں نے مجھے گلے لگا لیا۔ رحیم چاچا نے بڑی سادگی سے ہماری شادی کرا دی اور اس طرح گونگی جس کا اصل نام نجمہ تھا، میری جیون ساتھی بن گئی۔

گونگی کی قسمت کا ستارہ عروج پر تھا۔ کچھ ہی دنوں بعد وہاں سے میرا ٹرانسفر ہو گیا اور میں گونگی کو اداسی کی گہری دھند سے دور بہت دور لے گیا۔ میرا اپنا کوئی نہیں تھا۔ گونگی میری محبت کا محور بنی رہی جب بھی مجھے اس کے کرب ناک ماضی کا خیال آتا میں اسے ٹوٹ کر چاہنے لگتا۔ میری چاہت کی برسات سے اس کی سوکھی شاخِ تمنّا سیراب ہو کر لچکتی مہکتی رہی اور وہ بڑی تیزی سے اپنے ماضی کو بھولتے ہوئے نئی زندگی کے نئے رنگوں میں رنگتی چلی گئی۔ پھر میں نے اسے اس مقام پر دیکھا جہاں دل یہ ماننے کو تیار نہ تھا کہ یہ وہی لڑکی ہے جسے سب گونگی کہہ کر پکارتے تھے۔ پانچ برس رنگا رنگ بہاروں میں گزر گئے اور پھر گونگی میں غیر متوقع تبدیلیاں رونما ہونے لگیں۔ اس کی زبان میں تلخی اور طرز عمل میں بے پروائی دکھائی دینے لگی۔ میں اسے روکتا سمجھاتا رہا، مگر اس پر میرے سمجھانے کا کوئی اثر ہوتا۔

وقت گزرتا رہا۔ اور گزرتے وقت کے ساتھ وہ اخلاقی قدروں کو پامال کرتی ہوئی احساس کے

مرکز سے دور بہت دور اس تیز روندی کی طرح بڑھتی چلی گئی جو کسی باندھ کے ٹوٹنے پر اپنی لپیٹ میں آئی ہوئی ہر شے کو بہا لے جاتی ہے۔ وہ اپنی سوتیلی ماں کی طرح زندگی کے ہر شعبے میں نہ صرف مداخلت کرتی بلکہ ہٹ دھرمی کیا کرتی۔ پڑوسیوں سے ذرا ذرا سی بات پر جھگڑتی رہتی جس پر مجھے بڑی ندامت اٹھانی پڑتی۔ کبھی وہ بچوں کو اس قدر پیار کرتی کہ اس کی ممتا پر پیار آنے لگتا اور کبھی معمولی معمولی غلطیوں پر بچوں کی بے تحاشہ پٹائی کرتی اور جب میں اسے روکتا، وہ مجھے عجیب نظروں سے گھور کر دیکھا کرتی۔ اس وقت اسے دیکھ کر ایسا لگتا جیسے گونگی کے روپ میں کوئی ڈائن نمودار ہو گئی ہو۔

گونگی جسے دیکھنے کے لئے میری آنکھیں بے چین رہا کرتی تھیں۔ جس کے لیے کر میرا دل بھر آتا تھا، اب اس کے وجود سے مجھے گھبراہٹ سی ہونے لگی تھی۔ اس کی وہ آواز جسے میرا ذہن نقرئی گھنٹیوں سے تعبیر کیا کرتا تھا۔ جسے سننے کے لئے میرے کان ترستے تھے اس آواز سے مجھے کوفت ہونے لگی۔ میں گھر کے پریشان کن ماحول میں دنیا سے بے خبر اپنے آپ میں گم رہنے لگا تھا، مگر اس نے کبھی میری پریشانی کو سمجھنے کی کوشش کی اور نہ کبھی میری اداسی کو محسوس کیا۔ اسے اپنا ماضی یاد رہا نہ میری بے پناہ چاہت۔ بس اپنی سوتیلی ماں کی طرح وہ اپنے ہی پریوار پر ظلم ڈھاتی رہی ۔

ایک روز میں گہری سوچ میں ڈوبا ہوا بیٹھا تھا کہ اچانک اس نے مجھے انتہائی تلخ و تیز لہجے میں مخاطب کیا۔ میں اسے دیکھتا ہی رہ گیا۔ اس ذلت آمیز حرکت پر میں نے جواب دینا چاہا مگر تھوڑی دیر کے لئے مجھے یوں لگا جیسے میری قوت گویائی سلب ہو گئی ہو اور میں گونگا ہو گیا ہوں۔!! ☆☆

www.urduchannel.in

سمجھوتا

جب بھی مجھے اپنے وطن کی یاد آتی ہے، میں خیالوں کی حسین وادی میں گُم ہوجاتا ہوں اور ہر منظر پردہء سیمیں کی طرح میری آنکھوں کے سامنے گھومنے لگتا ہے۔ گاؤں کے قریب سے بہتی ہوئی ندی۔ ندی کے اس پار ہرے بھرے لہلہاتے کھیت، دورویہ مکانوں کے درمیان سے گزرتی ہوئی کچی مگر کشادہ سڑکیں آنگنوں میں ہنستے کھیلے بچوں کا شور۔ مل جل کر باتیں کرتے لوگ۔ گلیاں محلے اور دوست احباب۔ کئی دل کش مناظر یکے بعد دیگرے آنکھوں کے سامنے گھومنے لگتے ہیں اور میرا دل خوشی سے جھوم اٹھتا ہے۔ مگر جب اپنے صحن میں بیٹھی، سجی سنوری کرشنا کا چہرہ سامنے آتا ہے تو کچھ دیر کے لیے میرا من دکھی ہوجاتا ہے۔

کرشنا اپنی عمر کی پچیس بہاریں دیکھ چکی تھیں۔ ان بہاروں نے اسے بڑا دلفریب حسن وشباب عطا کیا تھا۔ صبح کی روشن چمکیلی دھوپ کی طرح سنہرے بال، سرخی مائل گورا رنگ، گہری نیلی آنکھیں، دراز

قد، لمبی گردن، دمکتے رخسار گلابی ہونٹ گویا زمین پر کوئی اپسرا اتر آئی ہو۔ اس کا معمول تھا کہ اپنی گھریلو مصروفیات سے فارغ ہونے کے بعد وہ بن سنور کر صحن میں بیٹھ جاتی۔ گلی سے گزرتے محلے کے نوجوان اسے آنکھوں ہی آنکھوں میں پیغامِ محبت دینے کے لیے بیتاب رہتے، ادھیڑ عمر کے لوگ بھی اسے دیکھ کر دل تھام کر رہ جاتے۔ مگر آس پاس کے اس ماحول سے بے خبر کرشنا کا خیال کہیں اور ہوتا۔ اسے دیکھ کر ایسا لگتا جیسے وہ کسی کا انتظار کر رہی ہو۔

کرشنا پر مرنے والوں میں سیٹھ جگ موہن کا اکلوتا بیٹا رنجیت اس کا ایک جھوٹا عاشق تھا۔ وہ ایک مدت سے اسے اپنے جال میں پھانسنے کی کوشش کر رہا تھا۔ گاؤں کی مجبور بے بس لڑکیوں کو سبز باغ دکھا کر شہر لے جانا، انھیں عیاش دولت مندوں کی ہوس کا شکار بنانا اور روپیہ کمانا اس کا پیشہ تھا۔ کرشنا کے پتا سیٹھ جگ موہن کی ٹرائیولز کمپنی میں بحیثیت ڈرائیور ملازم تھے۔ اس تعلق سے رنجیت کا ان کے گھر آنا جانا تھا۔ کرشنا رنجیت کے کالے دھندوں سے بخوبی واقف تھی اس لیے وہ اس کے ساتھ صرف رسمی گفتگو کیا کرتی تھی۔

کرشنا نہایت نیک دل، باصلاحیت لڑکی تھی۔ وہ تعلیم حاصل کر کے کچھ بننا چاہتی تھی۔ مگر تقدیر اور حالات کے ہاتھوں آدمی کھلونا ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہوتی ہے کہ انسان جو کرنا چاہتا ہے کر نہیں پاتا اور کبھی وہ سب کچھ کر گزرتا ہے جو وہ نہیں چاہتا۔ اقتصادی کمزوری اور ماں کی بیماری کے سبب کرشنا کالیج کی پڑھائی نہیں کر سکی تھی۔ ماں کی تیمارداری اور گھر کے کاموں سے فرصت پا کر وہ سلائی کام کیا کرتی۔ سلائی کی آمدنی سے اپنی اور چھوٹی بہن سدھا کی ضروریات پوری کر لیتی اور باپ کی قلیل تنخواہ میں بڑی کفایت شعاری سے گھر گرہستی چلایا کرتی تھی۔

جیسے ہر لڑکی جوانی کی دہلیز پر قدم رکھنے کے بعد اپنے تصور میں سنہرے خواب بنتی ہے، اسی

www.urduchannel.in

طرح کرشنا کا بھی ایک خواب تھا بڑا ہی خوب صورت خواب: اس کا شوہر کوئی ڈاکٹر، انجنیئر یا سرکاری افسر ہوگا۔ اس کی ازدواجی زندگی ایسی باوقار اور خوش حال ہوگی کہ دیکھنے والے رشک کریں گے، اور معاشرے میں ان کی بڑی قدر و منزلت ہوگی۔ مگر ابھی تک کرشنا کے لیے جو بھی رشتے آئے تھے ان میں اس کے خواب کی تعبیر نہ تھی۔ کرشنا کے ماں باپ بالکل سیدھے سادے لوگ تھے، اس لیے وہ ہر معاملے میں کرشنا کے فیصلے کو ہی ترجیح دیا کرتے تھے۔ وہ کرشنا کی شادی بھی وہ اسی کی مرضی کے مطابق کرنا چاہتے تھے۔

ایک روز کرشنا جب اپنی سہیلی کے گھر سے لوٹی تو اسے اپنے مکان میں کچھ مہمان دکھائی دیے، مکان میں داخل ہونے سے قبل ہی اس کی پڑوسن نے اسے قریب بلا کر بڑی بے تابی سے بتایا کہ اس کے لیے ایک انجنیئر کا رشتہ آیا ہے۔ کرشنا کے چہرے پر شرم اور خوشی کا ملا جلا رنگ بکھر گیا۔ وہ فوراً عقبی دروازے سے مکان میں داخل ہوئی۔ ایک خوبرو نوجوان، ادھیڑ عمر مرد عورت صوفے پر بیٹھے ہوئے تھے اور سامنے کرسی پر اس کے پتا جی تھے۔ کرشنا کو دیکھتے ماں اس کے پیچھے لپکی۔ اور پھر تھوڑی ہی دیر میں کرشنا چائے کا ٹرے لیے مہمانوں کے حضور پہنچ گئی۔ اس کی پلکیں جھکی ہوئیں اور دل کی دھڑکنیں تیز تھیں۔ نوجوان اسے دیکھتے ہی اس کے پیکر حسن میں ایسے اسیر ہوا کہ آنکھیں جھپکنا بھول گیا۔ اس کے والدین بھی کرشنا کی شائستگی اور خوب صورتی کو دیکھتے رہ گئے۔ جب نوجوان کے والد نے اپنی پسندیدگی کا اظہار کیا تو نوجوان کے چہرے پر خوشی اور مسرت کی لکیریں گہری ہوگئیں۔ کرشنا لجائی شرمائی برابر کے کمرے میں چلی گئی۔ آج اسے اپنا خواب حقیقت میں بدلتا دکھائی دے رہا تھا۔ مگر ساتھ ہی ایک انجانے خوف سے اس کا دل دھڑک رہا تھا۔ وہ باتیں سننے کے لیے دروازے کی اوٹ میں کھڑی ہوگئی۔ اسے اپنے پتا کی آواز صاف سنائی دے رہی تھی: ''میں ایک معمولی ڈرائیور ہوں، پچاس ہزار روپیے اور اپنی حیثیت کے مطابق دہیز ضرور دوں گا۔'' ''کیا کہا، پچاس ہزار۔!! میرا بیٹا انجنیئر ہے انجنیئر۔ پچاس ہزار

میں تو ایک اچھی سی موٹر سائیکل بھی نہیں خریدی جا سکے گی۔ معاف کرنا مسٹر، یہ رشتہ ہونا ممکن نہیں۔'' یہ جملہ کرشنا کے دل میں تیر کی طرح اتر گیا۔ پھر اسے اپنی ماں کی التجا سنائی دی: ''ایسا مت کیجیے بھائی صاحب، میری بیٹی بڑی سمجھدار اور پڑھی لکھی ہے۔ وہ آپ کے گھر کو سورگ بنا دے گی۔'' ''زمانہ بدل چکا ہے بہن جی صرف سمجھداری سے جیون سورگ نہیں بنتا، اس کے لیے دولت بھی ضروری ہے۔!'' نوجوان کی ماں نے کھڑے ہوتے ہوئے جواب دیا۔ اور کرشنا کے والدین جاتے ہوئے مہمانوں کو حسرت سے دیکھتے رہ گئے۔ اس رشتے نے کرشنا کو ایسی ٹھیس پہنچائی کہ اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ اسے ان لوگوں کے گھٹیا خیالات پر بڑا غصہ آ رہا تھا۔

تنہائی کرشنا کے لیے عذاب بن گئی تھی ایک ایسا عذاب جو اسے سوچ کی صلیب پر لٹکائے رکھتا۔ وہ ہر وقت مصروف رہ کر اپنا غم غلط کرنے کی ناکام کوشش کرتی رہتی۔

اپنی کدورت مٹانے کے لیے وہ اکثر قریبی پارک میں جا بیٹھتی۔ اسی طرح ایک روز وہ پارک کے ایک گوشے میں بیٹھی ڈوبتے سورج کو گہری نظر سے دیکھ رہی تھی۔ ''نمستے کرشنا جی'' وہ چونک پڑی۔ سامنے رنجیت بڑے شائستہ انداز میں کھڑا تھا۔ ''کیا دیکھ رہی ہو اس طرح آکاش میں؟'' اس نے قریب کے سنگی بینچ پر بیٹھتے ہوئے پوچھا۔ ''دیکھ رہی ہوں ڈھلتا سورج کیسے اپنی چمک کھو دیتا ہے۔'' اس نے اپنی ساڑی کا پلو درست کرتے ہوئے جواب دیا۔ ''کرشنا جی سورج تو کل پھر اپنی پوری چمک دمک کے ساتھ پورب سے نکل آئے گا۔ لیکن جوانی ایک بار ڈھل جاتی ہے تو پھر لوٹ کر نہیں آتی۔'' رنجیت نے بڑی خوب صورتی سے اپنے الفاظ کا جال پھینکا اور کرشنا تھپیڑا کھائی ہوئی کشتی کی طرح چکرا گئی۔ اس نے عجیب نظروں سے گھورتے ہوئے کہا، ''تم کہنا کیا چاہتے ہو۔؟'' ''میں جانتا ہوں تمہارے لیے ایک وکیل کا رشتہ آیا تھا، لیکن بات نہیں بنی۔ یہ بے رحم سماج تمہارے آدرش و چاروں کی کبھی قدر نہیں کرے گا۔ ہیرے کی قدر

www.urduchannel.in

تو جوہری کے پاس ہوتی ہے۔ میں کہتا ہوں چھوڑو اس چہار دیوری کو اور میرے ساتھ باہر کی دنیا میں آؤ۔ دولت تمہارے چرنوں میں ہوگی اور دامن میں خوشیاں ہی خوشیاں۔'' مجھے نہیں چاہیے ایسی خوشیاں'' کرشنا نے جھلا کر حقارت آمیز لہجے میں جواب دیا اور گھر کی طرف چل پڑی۔ اس کی طبیعت پہلے سے زیادہ رنجیدہ اور اداس ہوگئی تھی۔ وہ بوجھل قدموں سے گھر پہنچی اور کٹے پیڑ کی طرح بستر پر جا گری۔ رنجیت کی باتوں نے اس کے وجود میں ہل چل مچادی تھی۔ اس نے تکیہ سے اپنا منہ بھینچ لیا اور پھوٹ پھوٹ کر روتی رہی۔

کرشنا کے بے کیف شب و روز اپنے معمول کے مطابق گزر رہے تھے کہ ایک حادثے میں اس کے پتا کی موت ہوگئی۔ اور اس طرح بیمار ماں، چھوٹی بہن اور گھر کی تمام ذمہ داریاں اس کے سر آ گئیں۔ کہتے ہیں وقت بڑا مسیحا ہوتا ہے، دھیرے دھیرے ہر زخم بھر دیتا ہے۔ مگر جب ہر لمحہ خنجر بکف ہو تو پھر مسیحائی کیسی۔ کرشنا شاید اپنی دکھ بھری زندگی اور حالات سے تنگ آ کر خودکشی کر گزرتی، مگر اسے تو ہر حال میں جینا تھا کہ چھوٹی بہن اور بیمار ماں کی زندگیاں، اس کی زندگی سے زنجیر کی طرح جڑی ہوئی تھیں۔

رات کے دو بج رہے تھے، لیکن کرشنا کی آنکھوں سے نیند کوسوں دور تھی۔ وہ بے چینی سے کروٹیں بدل رہی تھیں۔ ماں کے مسلسل کھانسنے کی آواز نے اس کے دل میں ایک تلخ احساس جگایا، مفلسی کی دیمک کس طرح انسان کو چاٹ چاٹ کر کھوکھلا کر دیتی ہے اور زندگی عذاب بن جاتی ہے۔ پھر اس کی نظر قریب سوئی اپنی بہن سدھا پر پڑی۔ سدھا جوان ہوگئی ہے اور اب اسے بھی میری ہی طرح۔۔۔! نہیں نہیں، ایسا ظلم میں اس معصوم پر ہرگز نہیں ہونے دوں گی۔ وہ زیرِ لب بڑبڑائی۔ اور نامساعد حالات پر قابو پانے کی تدبیر سوچنے لگی۔ وہ سوچتی رہی مگر اسے کوئی راستہ سجھائی نہیں دے رہا تھا۔ اس کے ذہن میں رنجیت کی باتیں ابھر آئیں، اور اس کی آواز سنائی دی، ''یہ بے رحم سماج۔۔۔!''

وہ سوچتی رہی۔ اور گہری کشمکش میں مبتلا ہوگئی، ایسی اذیت ناک کشمکش جیسے وہ اپنے ہاتھوں اپنا گلا دبا کر خود کُشی کر رہی ہو۔ بالآخر پسینے میں شرابور اس کا وجود ایسے شانت ہوگیا جیسے طوفان گزر جانے کے بعد سمندر پرسکون ہو جاتا ہے۔

دوسرے روز کرشنا اپنے معمول کے مطابق بن سنور کر صحن میں بیٹھی ہوئی تھی، لیکن آج وہ اپنے سپنوں کے شہزادے کا نہیں، بلکہ رنجیت کا انتظار کر رہی تھی۔!!

☆☆